واذکروا نعمۃ اللہ علیکم ومیثاقہ الذی واثقکم بہ

تنظیمِ اسلامی کا ترجمان

اور

دعوتِ تجدیدِ عہدِ الست و میثاقِ ایمان کا علمبردار

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

شائع کردہ

مرکزی مکتبہ تنظیمِ اسلامی

۳۶ - کے ، ماڈل ٹاؤن ، لاہور

چندہ سالانہ ۱۵/- ——— قیمت فی نسخہ ۱/۵

وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد ۲۵	ماہ جون ۱۹۷۷ء	شمارہ ٦

مشمولات

عنوان	مصنف	صفحہ
● عرض احوال	ڈاکٹر اسرار احمد	صفحہ ۱
● حقیقت زندگی	" " "	۳
● مولانا آزاد مرحوم کا مجوزہ 'دارالارشاد'	اختر راهی ایم اے	" ۱۷
● مسئلہ شفاعت	محمد یونس ایم اے	" ۱۹
● حضرت عثمان غنیؓ : ایک نشری تقریر	ڈاکٹر اسرار احمد	" ۲۵
● اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟	مولانا مودودی	" ۲۹
● تنظیم اسلامی کے پہلے سالانہ اجتماع کی روداد کا خلاصہ	جمیل الرحمٰن	" ۴۱
● تنظیم اسلامی کی اساسی دعوت	چند آیات قرآنی	" ۵۵

★

مرتب : شیخ جمیل الرحمٰن

مقام اشاعت : ۳٦ ، کے ۔ ماڈل ٹاؤن ۔ لاہور (فون : ۳۵۲٦۱۱)

ڈاکٹر اسرار احمد (ناشر) نے بااہتمام چوھدری رشید احمد (طابع) مکتبہ جدید پریس
شارع فاطمہ جناح سے چھپوا کر مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی ،
۳٦ ۔ کے ماڈل ٹاؤن ۔ لاہور سے شائع کیا ۔

اسرار احمد

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

عرضِ احوال

'میثاق' کا یہ شمارہ قارئینِ کرام تک قدرے تاخیر سے پہنچے گا۔ دراصل حالات کچھ ایسے تھے کہ راقم الحروف کا خیال تو یہ تھا اب دو ماہ کی یکجا اشاعت ہی پیش کی جائے لیکن بعض احباب نے تقاضا کیا کہ ادھر کچھ عرصہ سے پابندئ اشاعت کی جو روایت قائم ہوئی ہے اسے نہ توڑا جائے اور خواہ کسی قدر تاخیر ہی سے سہی جون کا شمارہ بہرحال شائع ضرور کیا جائے۔ چنانچہ یہ اشاعت حاضرِ خدمت ہے ....

ان سطور کے عاجز اور ناکارہ راقم کو نہ 'مصنّف' ہونے کا دعویٰ ہے نہ 'صحافی' بلکہ وہ از اوّل تا آخر قرآنِ حکیم کا ایک حقیر سا طالبِ علم ہے یا زیادہ سے زیادہ ایک ادنیٰ سا مدرّس و معلّم ــــ اور واقعہ یہ ہے کہ 'لکھنا' اُس کا 'پیشہ' تو درکنار 'مشغلہ' تک نہیں ہے۔ آج سے چند سال قبل بھی جب بعض احباب نے شکایت کی تھی کہ تم پابندی سے کیوں نہیں لکھتے تو راقم نے بھی جواباً دوستوں سے علامہ اقبال کے الفاظ میں شکوہ کیا تھا کہ : ــــ

"من اے میرِ اُمم داد از تو خواہم — مرا یاراں غزل خوانے شمردند"

اور "نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست — سُوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را !"

چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ میرا معاملہ بھی ٹھیک وہی ہے جو علامہ مرحوم کا تھا کہ جس طرح وہ عام شعراء کی طرح فرمائشی شعر گوئی کبھی نہ کر سکے، اسی طرح میں بھی دوسرے صحافی حضرات کی طرح صرف اس وجہ سے کبھی کچھ نہ لکھ سکا کہ چونکہ پرچہ شائع کرنا ہے لہٰذا کچھ نہ کچھ ضرور لکھا جائے ــــ البتہ جس طرح علامہ مرحوم پر جب 'آمد' ہوتی تھی تو گویا ایک سیلاب اُمڈ آتا تھا جس کے آگے وہ خود بھی چاہتے تو بند نہ باندھ سکتے تھے۔ اسی طرح قارئین کے علم میں ہے کہ جب اندر سے کوئی خیال یا جذبہ زور لگاتا ہے تو چالیس چالیس صفحات کے 'تذکرہ و تبصرہ' بھی راقم کے قلم سے نکلتے رہے ہیں اور اس کیفیت میں صورتِ واقعہ یہی ہوتی ہے کہ میں قلم کو روکنا چاہوں تو بھی نہیں رکتا !

مزید برآں، وقتی حالات و واقعات اور قومی و سیاسی مسائل و معاملات پر راقم نے جان بوجھ کر اس لیے بھی لکھنا ترک کر دیا تھا کہ اس میں فائدہ بہت کم اور نقصان بہت زیادہ ہے۔ اس لیے

کہ ہمارے یہاں ایک عظیم اکثریت کا حال یہ ہے کہ وہ عقل کا کام جذبات سے لیتی ہے اور بہت ہی کم لوگ ایسے ہیں جو ٹھنڈے دل کے ساتھ معاملات پر غور کرنے پر آمادہ ہوں۔ اب اگر دوسروں کی بولیوں ہی میں اپنی بولی بھی شامل کرنی ہو تو آخر بولنا چہ ضرور؟ اور اگر بات وہ کرنے کی کوشش کی جائے جو خود آپ کو نظر آ رہی ہو تو چاہے دو چار سال بعد تو داد مل جائے کہ واقعی تم نے اس وقت بالکل ٹھیک تجزیہ کیا تھا۔ لیکن بروقت تو اکثر و بیشتر صورت یہ پیدا ہوتی ہے کہ قریبی رفقاء و احباب کی اکثریت بھی ناراض ہو جاتی ہے۔

راقم نے اوّلاً ۱۹۶۷ء میں اور پھر ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۱ء تک جو سیاسی تجزیے سپردِ قلم کئے تھے ان کے بارے میں بعد میں تو سب نے یہ مانا کہ وہ مبنی بر حقیقت تھے لیکن اس وقت تو بعض بزرگوں تک کو یہ شک ہو گیا تھا کہ شاید راقم بھی 'سوشلسٹ' ہو گیا ہے۔ حتّٰی کہ فروری ۱۹۷۱ء میں حج کے موقع پر راقم حیران رہ گیا جب مسجدِ حرام میں عین کعبۃ اللہ کے سامنے مولانا عبدالغفار حسن مدظلہ نے اچانک اس سے سوال کیا کہ: "سچ سچ بتایئے آپ سوشلسٹ تو نہیں!" ___ جواباً پہلے تو راقم صرف اِنّا لِلّٰہ پڑھ کر رہ گیا بعد میں جیسے بھی ممکن ہوا مولانا کی تسلی کرائی۔ یہ دوسری بات ہے کہ تقریباً دو سال بعد جب ایک محفل میں راقم کے وہ اداریے پڑھے گئے تو حاضرین میں سے بعض نے شدّتِ حیرت کے باعث یہ باور کرنے ہی سے انکار کر دیا کہ یہ ۷۰-۱۹۶۹ء میں لکھے گئے تھے۔

گزشتہ چار ماہ کے دوران ہمارے ملک میں جو حالات و واقعات رُونما ہوئے ہیں ان کے ضمن میں بھی واقعہ یہ ہے کہ معاملہ کچھ ایسا ہی ہے کہ اگرچہ میں یہ کہنے کی جرأت تو نہیں کر سکتا کہ ؎

پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے — لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

تاہم یہ ضرور اندیشہ ہے کہ اگر اپنی حقیقی رائے تفصیلاً عرض کر دوں تو جو جذباتی فضا اس وقت ملک و ملت پر طاری ہے اس کے پیشِ نظر جان کی امان پانا بھی مشکل ہو گا۔ دوسری طرف ہمارے نزدیک ہماری اصل کمزوری جڑ اور بنیاد کی ہے۔ ملت کے مسائل و مشکلات کا حل فوری اور وقتی تدابیر سے ممکن نہیں۔ اس کے تمام مسائل کی جڑ ہے ایمان اور یقین کا اضمحلال ہی نہیں، زوال و فقدان اور اللہ اور اس کے دین کے ساتھ خلوص و اخلاص نہیں بلکہ منافقت و عناد کا معاملہ۔ اور ہم علیٰ وجہ البصیرت جانتے ہیں کہ جب تک اس کمی کی تلافی نہ ہو سطحی لیپ پوت سے کچھ حاصل نہیں ہو گا ___ تو پھر ان مسائل میں الجھنا چہ سُود؟ ___ 'صحافی' تو اپنے

(بقیہ صفحہ ۱۶ پر دیکھیں)

حقیقتِ زندگی

از قلم

ڈاکٹر اسرار احمد

زندگی محض "عناصر میں ظہورِ ترتیب" ہی کا نام ہے یا اس "پردۂ زنگاری" میں کوئی حقیقتِ کبریٰ "معشوق" بنی چھپی بیٹھی ہے؟ اسی طرح موت زندگی کے خاتمے کا نام ہے یا یہ بجائے خود زندگی ہی کا ایک "وقفہ" ہے! ع "۔ یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر!"

ہم اپنی زندگی کو "امروز-و-فردا" کے پیمانوں سے ناپیں اور حسرت سے پکار اٹھیں کہ

ے "عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن — دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں"

یا اسے ع: "جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں" مانیں اور اپنی ابدیت کے سرور انگیز تصور سے شاد کام ہوں؟

اس مسئلے کے حل کا سارا دارومدار اس پر ہے کہ آیا ہم محض "عالمِ محسوسات" تک محدود رہنے کا فیصلہ کرتے ہیں اور صرف 'حواسِ خمسہ' کی محدود دریافتوں پر اکتفا کرتے ہیں یا عقل و وجدان کی قوتوں کو بھی کام میں لاتے ہیں اور "اپنے من میں ڈوب کر" "سُراغِ زندگی" کو پانے کی سعی کرتے ہیں۔

'عالمِ محسوسات' اور 'حواسِ خمسہ' تک محدود رہیے تو زندگی بس پیدائش سے موت تک کے وقفے کا نام ہے۔ قرآن مجید ان مومنین تجربہ و شہود کے تصورِ حیات کو ان الفاظ میں بیان فرماتا ہے:-

اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ۝ (الانعام)	ہمارے لیے زندگی نہیں مگر یہی جینا کی اور ہم کو پھر نہیں زندہ ہونا۔
اور مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيٰى وَمَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ (حاشیہ)	کچھ نہیں بس یہی ہمارا جینا ہے دنیا کا۔ ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہم جو مرتے ہیں سو محض زمانہ ہے۔

اور اُن کے ذہن کی پستی اور علم کی کوتاہی پر ان الفاظ میں تبصرہ فرماتا ہے:-

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (الروم)	یہ لوگ صرف دنیوی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں۔
اور ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ط (النجم)	بس یہیں تک پہنچ ہے اُن کی علم میں!

کیا واقعی زندگی بس اِسی مختصر سے وقفے کا نام ہے؟ ہمارے حواسِ خمسہ یقیناً ولادت کے ماقبل اور موت کے مابعد کے بارے میں بالکل لاچار و بے بس ہیں۔ لیکن کیا عقلِ انسانی اسے باور کرتی ہے؟ ذرا آنکھیں بند کر کے اِس وسیع و عریض کائنات کی عظمت و وسعت کا تصوّر کرو! پھر سوچو کہ اِس کائنات کا 'مرکزی وجود' انسان ہے سلسلۂ تخلیق کا کمال! ارتقائے حیات کی آخری منزل!

تو کیا اس کی حقیقت بس یہی کچھ ہے کہ بچپن کے "لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ"[1] اور بڑھاپے کے "لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا"[2] کے مابین ایک تھوڑے سے وقفے کے ہوش و شعور کا نام حیاتِ انسانی ہے۔ ع:- "اک ذرا ہوش میں آنے کے خطاوار ہیں ہم!"

جو کوئی 'حیاتِ انسانی' کے اِس تصوّر پر مطمئن ہو سکتا ہو[3]، وہ ہو۔ آخر سطحِ ارض پر انسان ہی تو نہیں بستے۔ لاتعداد حیوانات، چرند پرند بھی یہیں بس رہے ہیں، تو کون سے تعجّب کی بات ہے کہ خود انسانوں میں ایک گروہِ کثیر انسان نما حیوانوں ہی کا ہو!

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (الاعراف)	وہ دل رکھتے ہیں لیکن غور نہیں کرتے آنکھیں رکھتے ہیں، پر دیکھتے نہیں، کان رکھتے ہیں پر سُنتے نہیں۔ وہ حیوانوں کی مانند ہیں بلکہ اُن سے بھی گئے گزرے

---

[1] اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ ..... الآیۃ (سورۂ حدید)
جان لو کہ دنیا کی زندگی لعب و لہو ہے ..... الخ

[2] وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا (سورۂ حج)
اور تم میں سے کچھ لوٹائے جاتے ہیں نکمّی عمر کو تاکہ نہ جانیں جاننے کے بعد کوئی چیز۔

[3] وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا (سورۂ یونس)
اور راضی ہو گئے حیاتِ دُنیوی سے اور اسی پر مطمئن ہو گئے۔

اپنی حقیقت سے بے خبر اور اپنی عظمت سے غافل یہ انسان نما حیوان درحقیقت "اِک ذرا ہوش میں آنے کے" بھی بس مغالطے ہی میں مبتلا ہیں۔ وحیٔ الٰہی تو انہیں زندہ ہی تسلیم نہیں کرتی۔

فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ (سورۂ روم)
کیوں کہ تم مردوں کو نہیں سُنا سکتے اور نہ ہی بہروں کو اپنی پکار سُنا سکتے ہو۔

جن کا حال یہ ہو کہ ؎ : "روح سے تھا زندگی میں بھی تہی جن کا جسد" — وہ کب 'حیاتِ انسانی' کے لطیف حقائق کا ادراک کر سکتے ہیں! قفسِ حواس کے اِن زندانیوں کو کون باور کرا سکتا ہے کہ ؎

"ایسے کچھ تار بھی ہیں سازِ حقیقت میں نہاں
چھُو سکے گا نہ جنھیں زخمۂ مضرابِ حواس"

ہاں! جن کا ذہن اِس "چار دن" کی "عمرِ دراز" پر مطمئن نہ ہوتا ہو، جن کے جسدِ خاکی میں حیاتِ حقیقی کروٹیں لے رہی ہو اور جنھیں خود اپنے اندر ہی کوئی چیز اپنی عظمت کی جانب اشارے کرتی محسوس ہو اُن کے "ضمیر" پر جب "نزولِ کتاب" ہوتا ہے تو حقیقتِ حیات کی "گرہ"[1] کھلتی ہے اور وحیٔ الٰہی کی بدلی سے حقائق کی بارش ہوتی ہے تو اُن کی عقل و وجدان کی پیاسی زمین کو ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے اُسے بعینہٖ وہی چیز مل گئی جس کی اُسے پیاس تھی۔ اور تب وہ حیاتِ انسانی جو حواسِ خمسہ کی "بندگی" میں گھٹ کر جُوئے کم آب نظر آتی تھی ذہنِ انسانی کے اُن کے چنگل سے "آزاد" ہوتے ہی ایک "بحرِ بیکراں"[2] کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور یہ 'حیاتِ دنیوی' جو لاعلمی اور بے خبری میں "اصلِ حیات" قرار پا گئی تھی، سکڑ اور سمٹ کر اصل کتابِ حیات کے محض ایک دیباچے اور مقدمے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ صاعقۂ حق کوند کر اعلان کرتا ہے:۔

وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۝ (سورۂ عنکبوت)
اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔

اور انسانوں کے اس عظیم ہجوم پر نظر ڈالتے ہوئے جو حیاتِ دنیوی کے لہو و لعب

---

[1] تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب — گرہ کُشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشّاف (اقبال)
[2] بندگی میں گھُٹ کے رہ جاتی ہے اِک جُوئے کم آب — اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

ہی کو اصلِ حیات قرار دیئے بیٹھا ہے، حسرت کے ساتھ پکارتا ہے۔

لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۝ — کاش کہ یہ جانتے!

کبھی ڈانٹا جاتا ہے:-

كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ (سورۂ قیامہ) — کچھ نہیں بس تم دُنیا سے محبّت کرتے ہو اور آخرت کو تج دیتے ہو۔

کبھی شکوہ کیا جاتا ہے:-

بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى (سورۂ اعلیٰ) — تم حیاتِ دنیوی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت بہتر بھی ہے اور باقی رہنے والی بھی۔

اللہ! اللہ! کیا انقلاب ہے، کہاں یہ ذہن کی تنگی کہ زندگی بس یہی زندگی ہے اور کہاں یہ وسعتِ نظر کہ حیات ابدی اور سرمدی ہے جس کی کوئی انتہا نہیں! کجا یہ مایوس کن تصوّر کہ موت سلسلۂ حیات کا اختتام ہے اور کجا اِس حقیقت کا ادراک کہ موت تو اصل "شہرِ زندگی" کا دروازہ ہے۔

بدقسمتی سے اُخروی زندگی کے 'ماننے والوں' میں بھی کم بلکہ شاذ ہی اُس کے 'جاننے والے' ہیں۔ اُس کا 'ماننا' جس قدر آسان ہے 'جاننا' اُسی قدر دشوار ہے۔ 'ماننا' تو محض توارث سے بھی مل جاتا ہے لیکن 'جاننے' کیلئے اپنے ظرفِ ذہنی کو وسیع و عمیق کرنے کی ضرورت ہے۔ اور اس کا موقعہ آج کی مادّہ پرست دُنیا میں کسے نصیب ہے!

ماننے والوں کی ایک غالب اکثریت نے 'حیاتِ دُنیوی' کو اصل کتاب 'جان' کر 'حیاتِ اُخروی' کو بس اس کے تتمّے اور ضمیمے کی حیثیت سے 'مانا' ہے۔ حالانکہ 'جاننا' یہ چاہیئے کہ اصل کتابِ حیات تو موت کے بعد کھلنے والی ہے۔ یہ حیاتِ دُنیوی تو بس اُس کا ایک دیباچہ ہے یا مقدّمہ! وہ حقیقت ہے اور یہ محض اُس کا ایک عکس۔ وہ ابدی ہے اور لامتناہی ہے اور یہ عارضی ہے اور مختتم، وہ حقیقی اور واقعی ہے اور یہ اُس کے مقابلے میں محض کھیل تماشا بلکہ "متاعِ غرور"۔۔۔ آیاتِ بیّنات!

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ (سورۂ رعد) — اور دنیا کی زندگی کچھ نہیں آخرت کے آگے مگر متاعِ حقیر۔

فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي — سو کچھ نہیں نفع اُٹھانا دُنیا کی زندگی کا

اَلْاٰخِرَۃِ اِلَّا قَلِیْلٌ (سورۂ توبہ)	آخرت کے مقابلے میں مگر تھوڑا۔
وَمَا ھٰذِہِ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَآ اِلَّا	اور یہ دُنیا کا جینا تو بس جی بہلانا
لَھْوٌ وَّلَعِبٌ (سورۂ عنکبوت)	اور کھیلنا ہے۔
وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ	اور دُنیا کی زندگی تو یہی ہے مال
الْغُرُوْرِ (سورۂ حدید و آلِ عمران)	دغا کا۔

اِسی حقیقت پر شاہد ہیں۔

لیکن 'حیاتِ دُنیوی' کی یہ ساری بے بضاعتی اور کم مائگی 'حیاتِ اُخروی' کے مقابلے ہی میں ہے۔ ورنہ بجائے خود یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ ذرا غور کرو جو کتابِ حکیم "موت" کو بھی ایک مثبت حقیقت قرار دے جو 'حیات' ہی کی طرح تخلیق کے مراحل سے گزری ہے[1]۔ وہ حیاتِ دنیوی کو کب بے حقیقت ٹھہرا سکتی ہے۔ یہ بے حقیقت صرف اُس وقت بنتی ہے جب اُس کا تقابل حیاتِ اُخروی سے کیا جائے اور متاعِ غرور اُس وقت قرار پاتی ہے جب نگاہیں اُس پر اِس طور سے مرکوز ہو جائیں کہ دل و دماغ حیاتِ اُخروی سے محجوب ہو جائیں۔ یہی رمز ہے قرآنِ حکیم کے اِس تبصرے میں کہ: یَعْلَمُوْنَ ظَاھِرًا مِّنَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا۔ یہ مومنین حیاتِ دُنیوی' خود حیاتِ دُنیوی کی حقیقت سے کب واقف ہیں۔ اِس کا بھی بس "ظاہر" ہی اُن کی نگاہوں کے سامنے ہے خود اس کی حقیقت آشکارا ہو جائے تو حیاتِ انسانی کے جُملہ حقائق تک رسائی کی راہیں روشن ہو جائیں۔ قرآنِ حکیم نے "حیاتِ دُنیوی" کو 'حیاتِ انسانی' کا ایک امتحانی وقفہ قرار دیا ہے:

خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ	بنایا جینا اور مرنا تاکہ تم کو جانچے کون تم
اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (سورۃ الملک)	میں اچھا کرتا ہے کام۔

یہ امتحان گاہ ہے، نتائج آخرت میں برآمد ہوں گے۔ ؎

قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانندِ حباب	اِس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی
یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے	پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو آخرت کی کھیتی سے تعبیر فرمایا ہے "اَلدُّنْیَا مَزْرَعَۃُ الْاٰخِرَۃِ"۔ غرض یہ کہ آخرت سے ملا کر دیکھو تو حیاتِ دُنیوی بھی ایک

---

[1] خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (سورۂ مُلک)
بنایا جینا اور مرنا تاکہ تم کو جانچے کون تم میں اچھا کرتا ہے کام۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

ٹھوس حقیقت ہے، بصورتِ دیگر اس کا کوئی حقیقی وجود ہی نہیں رہ جاتا۔
آخرت سے قطعِ نظر، حیاتِ دنیوی کی حقیقت اِس کے سوا اور کیا ہے کہ :-

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا	جان رکھو کہ دنیا کی زندگی یہی ہے کھیل
لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ وَّ زِيْنَةٌ وَّ تَفَاخُرٌۢ	اور تماشا اور بناؤ اور بڑائیاں کرنی آپس
بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَ	میں اور بہتات ڈھونڈنی مال کی اور اولاد
الْاَوْلَادِ (سورۂ حدید)	کی -!!

لیکن بچپن کے کھیل کود، نوجوانی کی آرائش و زیبائش اور بناؤ سنگھار، شباب کے فخر و مباہات اور کہولت کے تکاثرِ اموال و اولاد کے ان ہی ادوار سے گزرتے ہوئے "اِک ذرا ہوش میں آنے" سے حیاتِ دنیوی ایک حقیقتِ کبریٰ اور نعمتِ غیر مترقبہ کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ اور اگر یہ ہو جائے تو بس یہی حاصلِ حیات ہے۔ اگرچہ یہ ایک دردناک حقیقت ہے کہ یہ "ہوش" کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے ۔ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۞ [۱]

ہوش میں آکر اگر حقیقت کی کوئی جھلک دیکھ پاؤ اور پھر اُسی کے رُخِ زیبا کے پرستار اور اُسی کی زُلفِ گرہ گیر کے اسیر ہو جاؤ تو بس یہی سرمایۂ حیات ہے، پھر جب تک یہاں رہو گے چین اور سکون سے رہو گے اور "اَحَقُّ بِالْاَمْنِ [۲]" قرار پاؤ گے، موت حجلۂ عروسی میں داخلے سے زیادہ خوش آئند نظر آئے گی اور اُس کا استقبال مسکراتے ہوئے کرو گے ؎

نشانِ مردِ مومن با تو گویم [اقبالؒ] چوں مرگ آید تبسّم بر لبِ اوست

اور وہاں اُٹھو گے تو اِس حال میں کہ :-

نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ	اُن کی روشنی دوڑتی ہے اُن کے آگے
وَبِاَيْمَانِهِمْ (سورۂ تحریم)	اور اُن کے داہنے۔

اور پھر ابدالآباد تک امن اور سکون ہی میں نہیں رہو گے بلکہ تمہاری مشاہدۂ حق کی لحظہ بہ لحظہ بڑھتی ہوئی پیاس کو آسودگی عطا کی جائے گی۔ یہاں تک کہ تم "حقیقت الحقائق" اور "جانِ جاناں" کا مشاہدہ کرو گے!

---

[۱] "اور یہ بات ملتی ہے اُسی کو جس کی بڑی قسمت ہو" (سورۂ حٰم سجدہ) (ترجمہ شیخ الہندؒ)
[۲] "فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ" (سورۃ الانعام)
(اب دونوں فریقوں میں کون مستحق ہے دلجمعی کا) (ترجمہ شیخ الہندؒ)

وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌ اِلٰی	کتنے منہ اُس دن تازہ ہیں اپنے رب کی
رَبِّھَا نَاظِرَۃٌ (سورۂ قیامہ)	طرف دیکھنے والے۔

اور اگر ہوش میں نہ آئے، زمینی خواہشات ہی میں غلطاں و پیچاں رہے[1] اور اوندھے مُنہ پڑ کر پستی ہی پر نگاہوں کو جمائے رکھا[2] اور یہاں کی جھوٹی مسرتوں اور آسودگیوں ہی کی تلاش میں سرگرداں رہے تو یہ زندگی تمناؤں اور آرزوؤں کے "بحرِ لُجّی" میں دیوانہ وار ہاتھ، پاؤں مارتے ہی بیت جائے گی، جہاں "ظُلُمَاتٌ بَعْضُھَا فَوْقَ بَعْضٍ" کے سوا کچھ نہیں۔

اَوْ کَظُلُمٰتٍ فِیْ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ یَّغْشٰہُ	یا جیسے اندھیرے گہرے دریا میں چڑھی
مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِہٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِہٖ	آتی ہے اس پر ایک لہر، اس پر ایک
سَحَابٌ ظُلُمٰتٌ بَعْضُھَا فَوْقَ	اور لہر اور اس پر بادل، اندھیرے
بَعْضٍ ط (سورۂ نور)	ہیں ایک پر ایک۔

مرے گے اُس پیاسے کی موت جو سراب کو پانی سمجھ کر دیوانہ وار دوڑتا رہا۔ حتیٰ کہ انتہائی حسرت و یاس کی حالت میں جان دے دی۔

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَعْمَالُھُمْ کَسَرَابٍۭ	اور جو لوگ منکر ہیں اُن کے کام جیسے ریت
بِقِیْعَۃٍ یَّحْسَبُہُ الظَّمْاٰنُ مَآءً	جنگل میں، پیاسا جانے اُس کو پانی یہاں
حَتّٰٓی اِذَا جَآءَہٗ لَمْ یَجِدْہُ شَیْئًا	تک کہ جب پہنچا اس پر اس کو کچھ نہ پایا
وَّوَجَدَ اللّٰہَ عِنْدَہٗ فَوَفّٰىہُ	اور اللہ کو پایا اپنے پاس، پھر اُس کو
حِسَابَہٗ (سورۂ نور)	پورا پہنچا دیا اُن کا لکھا۔

اور وہاں اٹھو گے اس حال میں کہ زبان پر رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِیْٓ اَعْمٰی[3] کا شکوہ ہوگا۔
اور پھر رہو گے ابدالآباد تک اِس حال میں کہ نہ زندوں میں ہوگے نہ مردوں میں۔

ثُمَّ لَا یَمُوْتُ فِیْھَا وَلَا یَحْیٰی۔ (سورۂ اعلیٰ)	پھر نہ مرے گا اُس میں نہ جیے گا۔

---

[1] وَلٰکِنَّہٗٓ اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ ھَوٰىہُ (سورۂ اعراف)
"مگر وہ تو ہو رہا زمین کا اور پیچھے ہو لیا اپنی خواہشوں کے۔" (ترجمہ شیخ الہند)

[2] اَفَمَنْ یَّمْشِیْ مُکِبًّا عَلٰی وَجْھِہٖٓ اَھْدٰٓی اَمَّنْ یَّمْشِیْ سَوِیًّا عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (سورۂ ملک)
(بھلا ایک جو چلے اوندھا اپنے منہ کے بل وہ سیدھی راہ پائے یا جو چلے سیدھا ایک سیدھی راہ پر)

---

[3] اے رب کیوں اٹھالایا تو مجھ کو اندھا؟ (سورۂ طٰہٰ)

نہ عذاب کی سختی جینے ہی دے گی اور نہ موت ہی آئے گی کہ اُس سے چھٹکارا دلا دے۔

لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْهَا الْمَوْتَ (سورۂ دُخان) نہ چکھیں گے وہ اُس میں موت۔

دُنیا اور آخرت میں تضاد نہیں توافق ہے! غلط سمجھا جنھوں نے انہیں ایک دوسرے سے مختلف سمجھا۔ یہ دونوں باہم دگر پیوستہ و ہم آغوش ہیں، ایک ہی حیاتِ انسانی کا تسلسل اِن میں جاری ہے۔ جس نے یہاں دیکھا وہی وہاں بھی دیکھے گا، جو یہاں "اعمٰی" زیادہ وہاں "اعمٰی" ہی نہیں بلکہ اَضَلُّ سَبِیْلًا ہوگا۔

وَمَنْ کَانَ فِیْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰی فَهُوَ	اور جو کوئی رہا اس جہان میں اندھا سو
فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی وَاَضَلُّ	وہ پچھلے جہان میں بھی اندھا ہے اور بہت
سَبِیْلًا (سورۂ بنی اسرائیل)	دُور پڑا ہوا ہے راہ سے۔

اور حقائق سے جیسے یہاں محجوب رہا ویسے ہی حقیقتِ کبریٰ کے مشاہدے سے وہاں محروم رہے گا:۔

کَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ یَوْمَئِذٍ	کوئی نہیں! وہ اُس دن اپنے رب
لَّمَحْجُوْبُوْنَ (سورۂ مطففین)	سے روک دیے جائیں گے۔

دیکھی اس حیاتِ مستعار کی عظمت! اور اس "اِک ذرا ہوش میں آنے" کی اہمیت۔ تبھی تو وحیِ الٰہی بار بار پکارتی ہے:۔ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ٥

قرآنِ حکیم بار بار پوچھتا ہے :۔

هَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَالْبَصِیْرُ	کب برابر ہو سکتا ہے اندھا اور
(سورۃ الانعام)	دیکھنے والا۔
هَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ	کوئی برابر ہوتے ہیں سمجھ والے، اور
وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ (سورۂ زمر)	بے سمجھ۔!!

حقیقت یہ ہے کہ اصل فرق 'علم' اور 'جہل' ہی کا تو ہے۔ بالکل صحیح کہا تھا جس نے کہا تھا: "علم نیکی ہے اور جہالت بدی" انسانوں کے اس جمِّ غفیر پر نگاہ ڈالو جو زمین میں بس رہا ہے اور دیدۂ بینا کو وا کرو۔ یہ ساری جہل ہی کی تو بساط بچھی ہوئی ہے! کون سے تعجب کی بات ہے اگر پیدائش سے موت تک کے وقفے ہی کو 'زندگی' سمجھنے والے انسان نما حیوانوں کا یہ ہجوم چھوٹی چھوٹی چیزوں پر لڑتے اور کٹ مرے، ایک دوسرے پر جھپٹے اور غرّائے بالکل

ٹھیک دیکھا تھا اُس صاحبِ چشمِ حقیقت بین نے جس نے انسانوں کی بستی میں بجائے انسانوں کے کتوں، بھیڑیوں اور سُوروں کو چلتے پھرتے دیکھا تھا۔ ! اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا کے جہلِ مرکب سے بطن سے حرص و لالچ، حسد و بغض، غیض و غضب، دشمنی و عداوت کے سوا اور کیا جنم پا سکتا ہے؟ یہ جھوٹی مسرتوں اور آسودگیوں کی تلاش میں سرگرداں، حقیر سی آرزوؤں اور تمناؤں کے پھندوں میں گرفتار اور طولِ امل کے سراب پر دم توڑتے ہوئے انسان اسی تصورِ حیات کا شاہکار تو ہیں!۔ ذرا سوچو اس جہل نے "احسنِ تقویم" میں تخلیق پائے ہوئے انسان کو کیسے اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ بنا کر رکھ دیا ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ	ہم نے بنایا آدمی خوب سے اندازے
تَقْوِيْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ	پر، پھر پھینک دیا اُس کو نیچوں سے
سَافِلِيْنَ ۝ (سُورۃ والتین)	نیچے۔!!

یہ کیسی چھوٹی چھوٹی اور حقیر سی چیزوں کو پا کر خوش ہی نہیں ہو جاتا اترانے لگتا ہے اور اکڑ کر چلنا شروع کر دیتا ہے اور کتنی چھوٹی تکالیف اور محرومیوں پر حسرت و یاس کی تصویر بن جاتا ہے۔

وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ	اور جب ہم آرام بھیجیں انسان پر تو
اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ وَاِذَا مَسَّهُ	ٹال جائے اور بچائے پہلو اور جب پہنچے
الشَّرُّ كَانَ يَئُوْسًا (سورۃ بنی اسرائیل)	اُس کو بُرائی تو رہ جائے مایوس ہو کر

'جہل' کے یہ سارے شاہکار تمہاری نگاہوں کے سامنے ہیں اور اُن کا مشاہدہ تم بچشمِ سر کر سکتے ہو لیکن 'علم' کے 'پیکر' کو دیکھنے کے لیے تمہیں اپنی چشمِ تصور کو وا کرنا ہوگا۔ ذرا اندازہ تو کرو اس ذہن کی وسعت کا جو حیاتِ دنیوی کو بس ایک سفر کا درجہ دے، جس کی منزل موت کی سرحد سے آگے، بہت آگے ہو ؏

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی!

"كُنْ فِي الدُّنْيَا كَاَنَّكَ غَرِيْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِيْلٍ"[1] جو یہاں کی جھوٹی مسرتوں اور حقیر سی

---

[1] حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم: "رہو دنیا میں ایسے کہ گویا تم اجنبی ہو یا مسافر!"

لذتوں پر "مَالِیْ وَلِلدُّنْیَا!"[1] کی نگاہِ غلط انداز ڈالتا ہوا حیاتِ اُخروی کی اِن معنوی اور حقیقی نعمتوں پر نگاہ جمائے بڑھا چلا جاتا ہے۔ "مالا عینٌ رأت ولا اُذنٌ سمعت ولا خطر علیٰ قلب بشر"[2] یہی تو ہیں حقیقت کے شناسا، قلبِ زندہ اور دیدۂ بینا کے مالک، روحِ حیات سے ہم آغوش اور حقیقت کے جمالِ جہاں تاب کے پرستار، یہ جیتے ہیں تو "حق" کا نشان بن کر اور مرتے ہیں تو حقیقت کی نشان دہی کرتے ہوئے۔ ع

جب وقتِ شہادت آتا ہے دل سینوں میں رقصاں ہوتے ہیں!

زندگی میں انہیں "احدی الحسنیین"[3] کے سوا کچھ نظر نہیں آتا اور موت ان کیلئے حیاتِ جاوید کا پیغام لے کر آتی ہے: "بَلْ اَحْیَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ"[4]

یہ ہے کرشمہ اس حقیقت کے علم کا کہ حیاتِ انسانی ابدی ہے۔ درختوں کو پھلوں سے پہچاننے والو! کوئی اندازہ کر سکتے ہو اس شجرِ حیات کی عظمت کا جس کا تصور ذہن کی اس وسعت، نگاہ کی اُس بلندی اور کردار کی اُس پختگی کے برگ و بار لاتا ہے: اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِی السَّمَاءِ"[5]

اور ابھی یہ تو ایک ہی رُخ ہے۔ "عظمتِ حیات" کی تصویر کا دوسرا رخ ابھی باقی ہے۔ ابدیت کے رخ کے "جاننے" والے چاہے کم ہوں۔ اُس کے "ماننے" والے بہت ہیں۔ لیکن تصویر کے اس دوسرے رخ کو تو شاذ ہی کسی نے دیکھا ہے۔

وحیِ الٰہی نے جہاں "حیات بعد الممات" کے حقائق کو اُجاگر کیا ہے، وہاں حیات

---

[1] حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم: "مالی و للدنیا؟ ما انا فی الدنیا الا کراکب استظل تحت شجرۃ ثم راح و ترکھا" (مجھے دُنیا سے کیا سروکار! دنیا میں میرا حال تو اس سوار سے زیادہ نہیں ہے جو ایک درخت کے سائے میں ذرا دم لے، پھر اُسے چھوڑ کر چل دے)

[2] حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم: جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سُنا اور نہ اُن کا اِدراک کسی انسان کے قلب کو حاصل ہوا۔

[3] قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَی الْحُسْنَیَیْنِ (سورۂ توبہ) (تو کہہ دے تم کیا اُمید کرو گے ہمارے حق میں مگر دو خوبیوں میں سے ایک کی) (ترجمہ شیخ الہند)

[4] (بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس کھاتے پیتے) (سورۂ آلِ عمران)

[5] (اُس کی جڑ مضبوط ہے اور ٹہنے ہیں آسمان میں) (سورۂ ابراھیم)

قبل الولادت" کی حقیقت کو بھی بالکل مخفی نہیں رکھا۔ اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ اس کا اظہار "بطرزِ خفی" کیا ہے! لیکن اس کا سبب بالکل معقول اور بادنیٰ تأمّل معلوم ہو جانے والا ہے۔ کتابِ الٰہی "ھُدًی لِلنَّاسِ[1]" ہے اور اس نے انسانوں کے مختلف طبقات اور گروہوں کی ضرورت کو گہری حکمت کے ساتھ پیشِ نظر رکھا ہے۔ "حیات بعد الممات" کا علم انسانوں کی ایک عظیم اکثریت کی "حیاتِ دُنیوی" کی عملی اصلاح کے لیے ناگزیر تھا۔ لہٰذا اس کے حقائق انتہائی جلی انداز میں روزِ روشن کی طرح کتاب کے ہر ورق پر نمایاں کر دیئے گئے۔ جبکہ حیات قبل الولادت کا علم صرف علم کی گہری پیاس رکھنے والے ذہنوں کی آسودگی کے لیے ضروری ہے۔ اور ظاہر ہے کہ "ذہنِ رسا" کے لیے "حقیقتِ خفی" کا ادراک کیا مشکل ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تصویرِ حیات کے اس رُخ کی بس کوئی جھلک ہی کہیں کہیں دکھائی گئی ہے! وحیِ الٰہی نے حیاتِ دنیوی سے قبل کی ہماری کیفیت کو "اَمْوَاتًا" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ کیسا صاحبِ عظمت اور کتنا حاملِ حکمت کلام ہے

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ	کس طرح کافر ہوتے ہو اللہ تعالیٰ
اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ	سے حالانکہ تم بے جان تھے، پھر جلایا
ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ	تم کو، پھر مارے گا تم کو، پھر اسی کی طرف
تُرْجَعُوْنَ ۝ (سورۂ بقرہ)	لوٹائے جاؤ گے۔

"اَمْوَاتًا" کے لفظ کی تفسیر جس کسی نے نُطَفًا فِي الْاَصْلَابِ[2] کے الفاظ بڑھا کر کی اس کی توجیہ بھی کم از کم ایک خالص حیاتیاتی حقیقت کی طرف تو اشارہ کر دیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جس نے اُسے "معدوم" کے ہم معنی قرار دیا اس نے وحیِ الٰہی پر طبع آزمائی کرنے کی جرأت کی ہے۔

ذرا غور کرو، حیاتِ انسانی کا یہ دَور جسے ہم 'حیاتِ دنیوی' کہتے ہیں، دو موتوں کے درمیان واقع ہوا ہے۔ ایک اس سے پہلے اور دوسری اس کے بعد۔ تو ہے کوئی جو بعد والی موت کو عدم سے تعبیر کرے؟ پھر کیسا ستم ہے کہ پہلی موت کو عدم کہنے والے چاہیے کم ہوں سمجھنے والے اکثر و بیشتر ہیں! واقعہ یہ ہے کہ نہ وہ موت معدوم ہونے کا نام ہے

---

[1] ہدایت ہے واسطے لوگوں کے (سورۂ بقرہ)

[2] آباء و اجداد کی پیٹھوں میں بشکلِ نطفہ (تفسیر جلالین)

نہ یہ کیفیتِ عدم کا اظہار، نہ اس پر زندگی ختم ہوگی نہ اس سے اس کی ابتدا ہوئی بلکہ جیسے بعد والی موت بجائے خود زندگی ہی کا ایک وقفہ ہوگی۔ اسی طرح قبل والی موت بھی زندگی ہی کا ایک دور تھی۔

اور جس طرح آنے والی موت کے بعد حیاتِ اُخروی کو شروع ہونا ہے بالکل اسی طرح گزشتہ موت سے قبل بھی ایک زندگی تھی جس کا سب سے بڑا واقعہ وہ عہدِ الست ہے جس کی خبر وحیٔ الٰہی نے دی اور جس کی یاد فطرتِ انسانی کی گہرائیوں میں محفوظ ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ	اور جب نکالا تیرے رب نے بنی آدم کی
مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ	پیٹھوں سے اُن کی اولاد کو اور اقرار
عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ	کرایا اُن سے ان کی جانوں پر۔ کیا میں
قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا۔ (سورۃ اعراف)	نہیں تمہارا رب؟ بولے ہاں ہے ہم
	اقرار کرتے ہیں۔

تو کون کہہ سکتا ہے کہ جب یہ میثاق لیا گیا اس وقت عہد کرنے والوں کو اپنی ہستی کا شعور نہ تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو کیا اس عہد و میثاق کی کوئی حیثیت اور اہمیت ہو سکتی تھی جو کلام الٰہی کے سلسلۂ استدلال کی ایک اہم کڑی ہے! یقیناً وہاں ہر انسان نے اپنی ہستی اور تشخص کے شعور کے ساتھ عہد باندھا تھا۔ تو پھر "حیات" کیا کسی اور چیز کا نام ہے؟

اِس حیاتِ اوّلیں کے اثبات پر قرآن حکیم کی وہ آیۂ کریمہ دلیلِ قطعی ہے جس میں اہلِ جہنّم کی فریاد ان الفاظ میں نقل کی گئی ہے کہ:

رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا	اے رب ہمارے تو موت دے چکا ہم
اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا	کو دو بار اور زندگی دے چکا ہم کو دو بار۔
فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ	اب ہم قائل ہوئے اپنے گناہوں کے پھر اب
(سورۂ غافر)	بھی ہے نکلنے کو کوئی راہ۔

ذرا 'وجود' اور 'ہستی' کے اس تسلسل پر غور کرو، جو اس آیۂ مبارکہ کے جامِ حقیقت نما سے چھلکا پڑ رہا ہے ؎

نغمے بیتاب ہیں تاروں سے نکلنے کیلئے	اک ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ساز

ہم پورے شعورِ حیات کے ساتھ موجود تھے، پھر ہم پر "اماتۃ اولیٰ" کا عمل ہوا۔

اور ہم ایک طویل عرصے کے لیے "پہلی موت" کی گود میں سو گئے۔ پھر "احیائے اولیٰ" ہوا اور ہم حیاتِ دُنیوی کی "بساطِ ہوائے دل" پر "وارد" ہو گئے۔ پھر "اماتۂ ثانیہ" ہوگی اور ہم پھر اک بار موت کی نیند سو جائیں گے اور پھر "احیاءِ ثانی" کا صُور پھونکا جائے گا اور ہم زندۂ جاوید ہو جائیں گے۔

ذرا ٹھہرو!

حیات کی عظمت کے ساتھ ساتھ موت کی حقیقت بھی دیکھ لو۔ یہ زندگی کا ایک 'وقفہ' ہی نہیں، سلسلۂ حیات کی ایک کڑی اور زندگی ہی کی ایک شکل ہے، بالکل نیند سے مشابہ، اب ذرا تلاوت کرو آیۂ کریمہ:

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ	اللہ کھینچ لیتا ہے جانیں جب وقت
مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا	ہو اُن کے مرنے کا اور جو نہیں مریں ان کو
(سُورۂ زمر)	کھینچ لیتا ہے اُن کی نیند میں ۔

اور گوشِ حقیقت نیوش سے سُنو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ:۔

وَاللّٰهِ لَتَمُوْتُنَّ كَمَا تَنَامُوْنَ ثُمَّ	خُدا کی قسم تم لازمًا مر جاؤ گے جیسے تم سو
لَتُبْعَثُنَّ كَمَا تَسْتَيْقِظُوْنَ ۔	جاتے ہو۔ پھر یقیناً اٹھائے جاؤ گے جیسے
(حدیث)	تم نیند سے بیدار ہوتے ہو۔

اور یاد کرو آپؐ کی وہ دُعا جو آپؐ کی ہر صبح کا معمول تھی :۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَحْيَانِيْ بَعْدَ	تعریف ہے اللہ کی جس نے مجھے
مَا اَمَاتَنِيْ وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ	زندگی عطا فرمائی، اس کے بعد کہ مجھ
(حدیث)	پر موت طاری فرما دی تھی۔

شاید حقیقت کی کوئی جھلک دیکھ لو!

اللہ اکبر! کیا "ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ" کا گُھپ اندھیرا طاری ہے ان ذہنوں پر جو موت اور زندگی کو عدم اور وجود کے ہم معنی سمجھ بیٹھے ہیں!

حقائق کے اس طرح درجہ بدرجہ اور "طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ" انکشاف کے بعد اب ذرا محسوسات کی دنیا سے "لب بہ بند و چشم بند و گوش بند!" ہو کر وجدان کی لامتناہی فضا میں

چشمِ تخیل کو وا کرو اور "تسلسلِ حیاتِ انسانی" کا مشاہدہ کرنے کی کوشش کرو۔ اگر کر پائے تو ایک عجیب سا کیف محسوس کرو گے اور سُرور و مستی سے ہم کنار ہو گے اور کیا عجب کہ تمہارے مُنہ سے نکل جائے :۔ سُبْحَانِیْ مَا اَعْظَمُ شَانِیْ[1] !

تو یہی حقیقت کا ادراک ہے ! ع

لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا !

(بقیہ عرضِ احوال)

پیشے کے تقاضے سے مجبور ہے کہ ضرور کچھ نہ کچھ لکھے بلکہ اس کا تو اخلاقی فرض ہے کہ :۔ "اُرِیْکُمْ مَا اَرٰی" کے مصداق وقتی حالات و واقعات کے بارے میں اپنی رائے ضرور ظاہر کرے۔ ہم نے صحافت کا دعویٰ ہی کبھی نہیں کیا کہ ایسی کوئی ذمّہ داری عائد ہو لہٰذا ہم تو بحمداللہ ہر طرف سے یکسو ہو کر صرف ایک کام میں لگ گئے ہیں یعنی امّت میں تجدیدِ ایمان کی ایک تحریک برپا کرنے کی کوشش اور اس کے لیے عملی منہاج کے طور پر دعوت رُجوع الی القرآن ! اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے اس فیصلے پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین !

بنا بریں موجودہ الوقت حالات کے بارے میں تو کم از کم فی الحال تو "مَنْ صَمَتَ نَجٰی" ہی پر عمل کرنے کا فیصلہ ہے۔ البتہ یہ خیال ضرور آ رہا ہے کہ متذکرہ بالا تجزیے کتابی صورت میں شائع کر دیے جائیں۔ شاید کہ کچھ لوگوں کو نظر آ جائے کہ آج جو فصل کاٹنی پڑ رہی ہے وہ کب اور کس کس نے بوئی تھی !

انہی اسباب کے تحت راقم نے پرچہ کلیۃً بھائی جمیل الرحمٰن صاحب کے حوالے کر دیا ہے کہ اور کچھ نہیں تو پابندیٔ وقت کے ساتھ کچھ مفید مواد قارئین کرام کے سامنے آتا رہے۔ گذشتہ ماہ انہیں اپنے بعض گھریلو مسائل کے باعث کراچی جانا پڑا۔ خیال یہ تھا کہ ہفتہ عشرہ تک واپسی ہو جائے گی لیکن وہاں اُن کے ایک جوان صاحبزادے کا ایک پیچیدہ قسم کا اپریشن درپیش آ گیا۔ چنانچہ واپسی مؤخر ہو گئی۔ بعد ازاں وہ خود بھی علیل ہو گئے چنانچہ قیام اور طویل ہو گیا۔۔۔ اس پر راقم نے تو جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا جا چکا ہے اپنے مزاج کی مناسبت سے فوراً فیصلہ کر لیا تھا کہ جون اور جولائی کی اشاعتوں کو ملا کر دیا جائے لیکن بعض احباب کے اصرار پر نظرثانی کرنی پڑی۔ چنانچہ یہ اشاعت حاضرِ خدمت ہے۔

---

[1] حضرت بایزید بسطامیؒ کا مشہور قول۔

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم

کی ایک خواہش جو عملی جامہ نہ پہن سکی!

قرآن حکیم کے داعیوں اور مسلغوں کی تربیت کے لئے ایک

دارالارشاد کا قیام

تحریر: جناب اختر راہی، ایم اے
بشکریہ ماہنامہ صدائے سلام، پشاور

جون ۱۹۱۲ء میں مولانا آزاد نے "الہلال" جاری کیا۔ "الہلال" نے قومی زندگی میں قرآن کی تعلیمات کے نفوذ کے لیے قرآنی تعلیمات کے مختلف پہلوؤں پر حکیمانہ تبصرہ کیا اور روزمرہ کے واقعات قرآنی روشنی میں پیش کئے۔ مولانا آزاد کی نگارشات سے قرآن فہمی عام ہوئی اور قوم میں یہ تڑپ پیدا ہوئی کہ اسے جملہ مشکلات کا حل قرآن میں تلاش کرنا ہے۔

نومبر ۱۹۱۴ء میں "الہلال" کی دو ہزار روپے کی ضمانت ضبط ہو گئی اور دس ہزار روپے کی ضمانت مزید طلب کر لی گئی۔ مولانا نے ضمانت داخل کرنے سے بہتر یہی سمجھا کہ "الہلال" بند کر دیا جائے۔ چنانچہ یہ معتبر ہفت روزہ جس نے برصغیر کی صحافت کو ایک نیا ولولہ اور قوم کو انقلاب انگیز پیغام دیا تھا، ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کے بعد شائع نہ ہو سکا۔

پہلی عالمگیر جنگ اپنی پوری ہولناکیوں کے ساتھ جاری تھی اور برطانوی حکومت نے طرح طرح کی پابندیاں عائد کر رکھی تھیں۔ تاہم مولانا نے ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء کو "البلاغ" کے نام سے نیا ہفت روزہ جاری کر دیا۔ "البلاغ" کا ایک مستقل کالم "باب التفسیر" تھا۔

مولانا آزاد نے "الہلال" اور "البلاغ" کے ذریعے قرآن فہمی کا ذوق پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اس مقصدِ جلیلہ کی خاطر ۱۹۱۴ء میں "دارالارشاد" قائم کیا۔ اس کے مقاصد بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> چند سال پیشتر کا واقعہ ہے کہ مشیتِ الٰہی نے اس عاجز کی رہنمائی کی اور "الہلال" نے قرآنِ حکیم کی تبلیغ و دعوت کی صدا از سرِ نو بلند کی لیکن اس عرصہ

میں جو کچھ ہوا وہ ایک دعوتِ عام تھی، جس کے ذریعے فہم و بصیرتِ قرآن کی نئی راہیں عوام و خواص نے اپنے سامنے دیکھیں اور قرآن کریم کے عشق و شیفتگی کا ایک نیا ولولہ دلوں میں پیدا ہو گیا۔ تاہم اس دعوت کی ایک دوسری منزل ابھی باقی ہے، اور وہی فی الحقیقت اہم تر مقام سعی و تعب ہے۔ یعنی قوم میں بکثرت ایسے افراد پیدا کیے جائیں جو انہی راہوں پر چل کر قرآن حکیم کے علوم و معارف کو بہ تکمیل حاصل کریں اور ان کے ذریعے قوم میں ارشاد و ہدایت اور احیائے دعوت و ذکر کا عملی سلسلہ بالعموم شروع ہو سکے۔

ہمارے کاموں کی بڑی قسمیں صرف دو ہی ہیں، مسلمانوں کی داخلی اصلاح و احیائے علم و عمل اور غیر قوموں میں اسلام کی تبلیغ۔ یہ دونوں کام بغیر کسی ایسی جماعت کی موجودگی کے انجام نہیں پا سکتے جس قدر تحریکیں، انجمنیں، کانفرنسیں اور متفرق کوششیں بغیر اس کے ہوں گی وہ اسی طرح ضائع ہو جائیں گی جس طرح اب تک ضائع ہو چکی ہیں۔ !!

'دار الارشاد' کا مقصد یہی ہے کہ دعوت الی القرآن کی اس دوسری منزل کا سر و سامان ہو اور تھوڑے وقت اور بہت زیادہ صرف علم و فکر سے ایک ایسی جماعت پیدا کی جائے جو قرآن حکیم کی دعوت و تبلیغ کی خدمت اور اصلاح و ارشادِ اُمّت کا فرض انجام دے سکے۔" (البلاغ ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء)

ان شاء اللہ العزیز

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے زیر اہتمام قرآن اکیڈمی کے قیام سے

مولانا مرحوم کی اس خواہش کے عملی جامہ پہننے کی صورت پیدا ہو جائے گی ؟

السعی منا والاتمام من اللہ تعالیٰ

مسئلہ شفاعت

قرآن حکیم کی روشنی میں

از قلم : محمد یونس ایم اے، ایم ایڈ

مسئلۂ شفاعت اُن مسائل میں سے ہے جن کی وضاحت اگرچہ قرآن پاک میں موجود ہے لیکن عام طور پر اُن کی توجیہہ غیر معقول انداز میں کی جاتی ہے۔ درحقیقت یہاں ٹھوکر صرف اُن افراد نے کھائی ہے جنھوں نے شفاعت کو عام مشاہدے میں آنے والی دُنیوی سفارش ہی کی طرح سمجھ لیا ہے۔ جس میں ایک مقتدر آدمی کسی مجرم کی سفارش کرتا ہے اور اُسے سزا سے بچا لیتا ہے اور اس طرح با اثر اور مقتدر لوگوں کے ساتھ تعلقات رکھنے والے لوگ قانون کی گرفت سے بے خوف ہو کر جرائم کرتے ہیں۔ اِسی قسم کی غلط فہمی یہود کے ایک گروہ کو ہوئی تھی جو "نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰہِ وَاَحِبَّآؤُہٗ" کا دعویٰ کرتے تھے اور اِسی دعویٰ کو اپنی نجات کے لیے کافی سمجھتے تھے اِس مغضوب طبقے کے افراد کی طرح کچھ مسلمانوں نے بھی بس کلمۂ طیّبہ کے اقرار باللّسان کو نجات کے لیے کافی خیال کر کے فرار کی راہ اختیار کر لی ہے۔ حالانکہ قرآن پاک کلمہ گو مسلمانوں سے اسلامی احکام پورے کے پورے عملاً اختیار کرنے کا تقاضا کرتا ہے بلفظِ الفاظِ قرآنی :— "اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً ط (اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ!) اس طرح قرآن پاک میں ایمان لانے والوں کو بھی ایمان لانے کو کہا گیا ہے، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ زبان سے توحید و رسالت کا اقرار کرنے والو! قلب کی گہرائیوں میں کلمۂ طیّبہ پر یقین پختہ کرو۔ جس کے نتیجہ میں تمھارے اعمال تقویٰ کی غربال سے چھن کر نکلیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ کلمۂ طیّبہ پڑھنے والوں کو طرح طرح کی آزمائشوں سے گزارے بغیر نہ چھوڑا جائے گا۔ یعنی کلمہ پڑھ کر جس عقیدۂ توحید و رسالت کا انھوں نے اقرار کیا ہے، اُس کی پختگی کا اندازہ مختلف امتحانات میں سے گزار کر کیا جائے گا۔ گویا کلمۂ طیّبہ کا زبانی اقرار النسان کو قانونی طور پر مسلمان تو بنا دیتا ہے مگر نجات کے لیے کفایت نہیں کرتا۔ ارشادِ خداوندی ہے : اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ○ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ

فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۝ (العنکبوت : ۱، ۲) "کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ 'ہم ایمان لائے' اور اُن کو آزمایا نہ جائے گا۔ حالانکہ ہم اُن سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں"

اسی مضمون کو قرآن پاک میں کئی جگہ مختلف پیرائوں میں بیان کیا گیا ہے جس سے بات پوری طرح واضح ہو گئی ہے مثلاً : اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (آل عمران: ۱۴۲) :- ("کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ جنّت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے جہاد میں جان لڑانے والے اور پامردی دکھانے والے کون ہیں؟")

معلوم ہوا کہ ہمیشہ سے اللہ تعالیٰ کا طریقہ یہی رہا ہے کہ وہ دعویٰ ایمان کرنے والوں کی آزمائش کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ سُنّت اللہ تبدیل نہیں ہوا کرتی۔ اس دور میں دعویٰ ایمان کرنے والوں کو آزمائش میں ڈال کر اُن کے دعویٰ کی عملی صداقت کیوں نہ دیکھی جائے گی اور اُن کے زبانی اقرار کو سُنّت اللہ کے خلاف کیسے قبول کر لیا جائے گا۔ جبکہ تکالیف و مصائب کی بھٹیوں سے خود رسولؐ اور اصحابِ رسولؐ کو بھی گزارے بغیر نہ چھوڑا گیا۔ حکیم الاُمّت علّامہ اقبال مرحوم نے آزمائش کے خوف کا اظہار اس طرح کیا ہے :-

چو می گویم مسلمانم، بلرزم که دانم مشکلاتِ لا اِلٰہ را!

اب وہ حدیث ملاحظہ ہو جس میں کلمہ گو کو جنّت کی بشارت ہے :-

عَنْ زَيْدِ بْنِ اَرْقَمَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُخْلِصًا دَخَلَ الْجَنَّةَ قِيْلَ وَمَا اِخْلَاصُهَا قَالَ اَنْ تَحْجِزَهُ عَنْ مَحَارِمِ اللّٰهِ :- (حضرت زید بن ارقم حضور صلی اللہ علیہ وسلّم سے نقل کرتے ہیں: "جو شخص اخلاص کے ساتھ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہے وہ جنّت میں داخل ہو گا۔" کسی نے پوچھا: کہ کلمے کا اِخلاص کیا ہے؟" آپؐ نے فرمایا: "یہ کہ وہ اسے حرام کاموں سے روک دے!") (طبرانی فی الاوسط الکبیر) اس حدیث سے یہ سمجھنا کہ کلمۂ طیّبہ زبان سے پڑھ لینا حصولِ جنّت کے لیے کافی ہے، پرلے درجے کی نافہمی ہے۔ قولِ رسولؐ تو سُورۃ العنکبوت کی محولہ بالا آیت کی سر تا سر تائید کر رہا ہے کہ نافع کلمہ صرف وہی ہے جو قائل کی زندگی میں انقلاب پیدا کر کے اسے متقی

(پرہیزگار) بنادے، یعنی وہ حرام کاموں سے پرہیز کرنے لگے۔

شفاعت کا مسئلہ بھی اسی قبیل سے ہے، یوں سمجھئے کہ کچھ اعمال ایسے ہیں کہ جو کسی مسلمان کی شفاعت کا تقاضا کریں گے اور اس طرح اس کی شفاعت کی جائے گی۔ مگر اس بات کو تو اللہ ہی جانتا ہے کہ شفاعت کا اعزاز کس کو ملے گا اور شفاعت کن کے حق میں نافع ہوگی۔ اگر ہر مدعیٔ اسلام کے حق میں شفاعت کو نافع سمجھ لیا جائے تو: "لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی" (کوئی بوجھ اُٹھانے والا کسی کا بوجھ نہیں اُٹھاتا) (سورۂ انعام: ۱۶۴) "اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ۝ وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ۝ وَاَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰی ۝ ثُمَّ یُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰی" (کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی کا بوجھ نہیں اٹھاتا، اور الانسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کی اُس نے کوشش کی۔ اور یہ کہ اُس کی سعی و کوشش عنقریب دیکھی جائے گی یا اُس کو دکھا دی جائے گی۔ پھر بدلہ دیا جائے گا اُس کو پورا بدلہ) (النجم: ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱) اور :- لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ : (ہر شخص نے جو نیکی کمائی ہے، اُس کا پھل اُسی کے لیے ہے اور جو بدی سمیٹی ہے اُس کا وبال اُسی پر ہے)۔ (البقرہ: ۲۸۶) کے قبیل کی آیات کی نہ صرف تکذیب ہوتی ہے بلکہ اِس بات سے عدل خداوندی پر بھی حرف آتا ہے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو خود وحیٔ الٰہی کے ذریعے حکم ملا کہ :- وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ : (اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ) (شعراء: ۲۱۴) اِس پر جناب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دادا کی اولاد کو جمع کیا اور مخاطب کر کے فرمایا: "اے بنی عبدالمطلب، اے عباس، اے صفیہ رسول اللہ کی پھوپھی، اے فاطمہ محمدؐ کی بیٹی، تم لوگ آگ سے اپنے آپ کو بچانے کی فکر کر لو۔ میں خدا کی پکڑ سے تم کو نہیں بچا سکتا البتہ میرے مال میں سے تم لوگ جو کچھ چاہو مانگ سکتے ہو۔"

قرآن پاک کی رُو سے کفّار کو تو کسی قسم کی شفاعت بھی نفع نہ دے گی۔ سورۃ الشعراء میں ذکر ہے کہ جب کفّار دوزخ میں جھونک دیئے جائیں گے تو وہ کہیں گے :- وَمَا اَضَلَّنَا اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ۝ فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ۝ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ ۝ (اور وہ مجرم لوگ ہی تھے جنھوں نے ہم کو اس گمراہی میں ڈالا اب نہ ہمارا کوئی سفارشی ہے اور نہ کوئی جگری دوست) (شعراء: ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱) اسی طرح سورۃ المدثر میں ذکر ہے کہ کافر کو کسی کی شفاعت نفع نہ دے گی: فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِيْنَ (المدثر: ۴۸) (پس سفارش

کرنے والوں کی سفارش اُن کو فائدہ نہ دے گی) رہے ایمان دار لوگ تو اُن کے حق میں سفارش قبول کی جائے گی لیکن وہ سفارش دنیا کی سفارش پر قیاس نہ کرنی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور جس کا جی چاہے اور جس کے حق میں جی چاہے سفارش کر دے۔ ایسی بے سروپا سفارش احکم الحاکمین کے حضور تو گمان بھی نہیں کی جا سکتی۔ قرآن شاہد ہے کہ "جو بھلائی کی سفارش کرے گا وہ اس میں سے حصّہ پائے گا۔ اور جو بُرائی کی سفارش کرے گا وہ اُس میں سے حصّہ پائے گا۔" (نساء : ۸۵) اب ایسا کون ہے جو خدا کی گرفت سے بے نیاز ہو کر مغضوب لوگوں کی سفارش کر کے اپنے آپ کو خدا کے غضب کا نشانہ بنالے۔ اسی لیے قرآن پاک کی تعلیم اس ضمن میں یہ ہے کہ اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش نہیں کر سکے گا بلکہ سفارش کرنے والے کو بھی بارگاہِ خداوندی سے جس کے حق میں سفارش کی اجازت دی جائے گی صرف اسی کے حق میں وہ سفارش کر سکے گا اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ سفارش کا مطلق حق صرف ربّ العالمین ہی کو ہے۔ سُورۂ زمر میں اِسی حقیقت کا بیان ہے : قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ۝ (کہہ دیجئے سفارش تو پُوری کی پُوری اللہ کے اختیار میں ہے۔)

قرآن کی رُو سے شفاعت تو ایک قسم کا اعزاز ہے جسے ربّ العالمین اپنے بعض بندوں کو عنایت فرمائے گا لیکن یہ اعزاز اُسی صورت میں ہے جبکہ شافع کی شفاعت کو شرفِ قبولیّت بخشا جائے۔ مگر خُدا کے بندوں میں سے کوئی عالم الغیب تو ہے نہیں جو کسی انسان کی زندگی کے تمام ظاہری و باطنی احوال و اعمال سے واقف ہو۔ اور اس واقفیّت کی بنا پر جان لے کہ فلاں کے حق میں وہ سفارش کرے تو وہ یقیناً قبول ہوگی۔ فلہٰذا عالم الغیب ہی اس بات کو جانتا ہے کہ کون شخص شفاعت کے لائق ہے۔ چنانچہ اُسی کے حق میں اللہ تعالیٰ اپنے اس معزز بندے کو شفاعت کا حق دے گا اور پھر اُس کی شفاعت کو شرفِ قبولیّت بخش کر بھرے اجلاس میں اُس عبدِ شافع کے حق میں اپنی شانِ شکوری کا اظہار فرما کر اسے سرفراز فرمائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جہاں جہاں شفاعت کا اثبات کیا گیا ہے وہاں عموماً عالم الغیب کا اذن ضروری قرار دیا گیا۔ سورۂ بقرہ میں ہے :- مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ :- (کون ہے جو اُس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے جو کچھ بندوں کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے اس سے بھی وہ واقف ہے) (البقرہ : ۲۵۵) پھر سورۂ طٰہٰ میں فرمایا

: يَوْمَئِذٍ لَّا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا ۝ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا ۝ (اس روز شفاعت کارگر نہ ہوگی اِلّا یہ کہ کسی کو رحمان اس کی اجازت دے اور اس کی بات سننا پسند کرے۔ وہ لوگوں کا اگلا پچھلا سب حال جانتا ہے اور دوسروں کو اس کا پورا علم نہیں) (طٰہٰ: ۱۰۹، ۱۱۰)

پس شفاعت کو مشروط باذنِ اللہ کرنا دراصل شافعین کو اہانت سے محفوظ رکھنے اور اُن کی تکریم کو حتمی بنانے کے لیے ہے۔ کیونکہ جس طرح یہ بات شافع کے لیے حد درجہ اکرام کا باعث ہے کہ اُسے بارگاہِ خداوندی سے شفاعت کی اجازت ملے اور پھر وہ شفاعت شرفِ قبولیت پائے۔ اسی طرح اگر کسی کی شفاعت میدانِ حشر میں ردّ کر دی جائے تو یہ اُس کے لیے رسوائی کا باعث ہوگی۔ اس لیے شفاعت کو باذن اللہ مشروط کر کے ربِّ شکور نے اپنے برگزیدہ اور نیک بندوں کے لیے میدانِ حشر میں رُسوائی کے امکان ہی کو ختم کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ پاک میں جہاں جہاں بھی شفاعت کا ذکر ہے وہاں باذن اللہ کی شرط بھی لگائی گئی ہے۔ سورۂ بقرہ اور سورہ طٰہٰ کی مذکورہ بالا آیات کے علاوہ سورۃ الانبیاء کی آیت نمبر ۲۸ ملاحظہ ہو: "لَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضَىٰ وَهُم مِّنْ خَشْيَتِهِ مُشْفِقُونَ ۝" (اور وہ کسی کی سفارش نہیں کرتے بجز اُس شخص کے جس کے حق میں سفارش سننے پر رحمٰن راضی ہو اور وہ اس کے خوف سے ڈرے ڈرے رہتے ہیں) اِس کے علاوہ سورۃ النّبأ میں روزِ محشر کا نقشہ اور شفاعت کا ذکر اس طرح ہے: - يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَائِكَةُ صَفًّا لَّا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ۝ (وہ دن جبکہ رُوح اور ملائکہ سب صف بستہ کھڑے ہوں گے، خدا بات نہ کریں گے۔ صرف وہی بول سکے گا جسے رحمٰن اجازت دے اور جو ٹھیک بات کہے) (النّبأ: ۳۸) فرشتے بھی بارگاہِ خداوندی میں بایں ہمہ تقرّب بدوں اجازت لب کُشائی نہ کر سکیں گے: وَكَم مِّن مَّلَكٍ فِي السَّمَاوَاتِ لَا تُغْنِي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا إِلَّا مِن بَعْدِ أَن يَأْذَنَ اللَّهُ لِمَن يَشَاءُ وَيَرْضَىٰ (کتنے ہی فرشتے آسمانوں میں ہیں جن کی سفارش کچھ بھی مفید نہیں ہو سکتی بجز اس صورت کے کہ اللہ سے اجازت ملنے کے بعد کی جائے اور ایسے شخص کے حق میں کی جائے جس کے لیے وہ سفارش سننا چاہے اور پسند کرے) (النجم: ۲۶)

نتیجہ اس ساری گفتگو کا یہ نکلا کہ اُصولی طور پر قیامت کا دن دوستیاں نبھانے یا سفارشیں

کرنے کا نہیں ہے جیسا کہ خود قرآن کہتا ہے :- لَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ (البقرہ : ۲۵۴) بلکہ عدل و انصاف کا دن ہے۔ اُسی عدل کا تقاضا ہے کہ احکم الحاکمین کی بارگاہ میں غیر معمولی فرمانبردار، برگزیدہ بندوں کو خصوصی اکرام و اعزاز سے نوازا جائے۔ چنانچہ انبیاء و رُسُل اور نیک لوگوں کو بعض دوسرے افراد کے حق میں سفارش کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے گی اور اسے شرفِ قبولیت بخشا جائے گا۔ چونکہ عالم الغیب اور شفاعت کا مطلق مختار اللہ تعالیٰ ہے اس لیے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کس کے حق میں سفارش کرنے کی کسی نبی یا ولی کو اجازت ملے گی۔ لہٰذا شفاعت پر بھروسہ کر کے نیک اعمال اور فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی قرآن کی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ آیاتِ شفاعت پر غور کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انسان کو زندگی میں خدا اور رسول کے احکامات کی ہر قدم پر پابندی کر کے اپنے آپ کو اس کا اہل بنانے کی کوشش کرنا چاہیئے کہ ربّ العزت کے ہاں سے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلّم کو اس کی شفاعت کا اذن مل جائے اور اس طرح اُس کی لغزشوں اور کوتاہیوں پر ستّار العیوب پردہ ڈال دے۔ گویا مسئلہ شفاعت اُن قرآنی تعلیمات کا اہم جُزو ہے جن میں جِدّوجُہد اور پرہیزگاری پر زور دیا گیا ہے۔ مکافاتِ اعمال سے غفلت کا جواز کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔ وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغ

مولانا امین احسن اصلاحی مدّظلّہٗ کی تفسیر
تدبّرِ قرآن کے بارے میں ایک اہم اعلان

تدبّرِ قرآن جلد اوّل کی طباعت کے سلسلے میں ایک مغالطے کے باعث بعض حضرات کو وہ نسخے ملے ہیں جن میں تفسیر سورۂ آلِ عمران شامل نہیں ہے۔ اس کمی کی تلافی کے لیے ایک محدود تعداد میں سورۂ آلِ عمران علیحدہ جلد کرالی گئی ہے۔ جو حضرات چاہیں طلب فرمالیں۔ اس کا ہدیہ علاوہ محصول ڈاک دس روپے ہے۔
(واضح رہے کہ مکمّل جلد اوّل کا ہدیہ -/۵۰ ہے اور بغیر آلِ عمران -/۴۰ تھا، لہٰذا نقصان خریداروں کا نہیں ہے سراسر ادارے کا ہے کہ کم از کم سات روپے کی جلد اضافی دینی پڑی)۔

المعلن : ناظم مکتبہ، مرکزی انجمن خدّام القرآن ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

حضرت عثمانِ غنی رضؓ

ایک نشری تقریر

ڈاکٹر اسرار احمد

نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے رشتے کے بھانجے اور دوہرے داماد، آپؐ پر ایمان لانے والوں میں پانچویں یا چھٹے اور آپؐ کے تیسرے خلیفۂ راشد، مجسّمۂ صدق و صفا اور پیکرِ علم و حیاء کامل الحیاءِ والایمان، سابقٌ بالخیراتِ والاحسان اور جامع آیاتِ القرآن، امامِ مظلوم، اور شہیدِ معصوم، حضرت عثمان ابنِ عفّان رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ ـــــ کے لقب "ذُوالنّورین" کا مشہور و معروف سبب تو یہ ہے کہ نبی اکرمؐ کی دو صاحبزادیاں یعنی حضرتِ رقیہؓ اور حضرتِ اُمّ کلثومؓ یکے بعد دیگرے اُن کے نکاح میں آئیں۔ اور اگرچہ اسلام میں اصل بنائے عزّت و شرف قرابت یا رشتہ داری نہیں ہے تاہم رسول اللہؐ سے قرابت یقیناً ایک بنائے فضیلت ہے اور اس ضمن میں جو شرف حضرتِ عثمانؓ کو حاصل ہوا ہے، اُس میں ظاہر ہے کہ کوئی بھی ان پر بازی نہیں لے جا سکتا! خصوصاً اِس بنا پر کہ اپنی ایک صاحبزادی کے انتقال پر دوسری کو ان کے نکاح میں دے دینے سے بخوبی ظاہر ہو جاتا ہے کہ آنحضورؐ کو کتنی محبت حضرتِ عثمانؓ سے تھی، اور آپ کس درجہ اعتماد اُن پر کرتے تھے۔ اِس ضمن میں "نُورٌ علیٰ نُورِہٖ" کا مصداقِ کامل ہے یہ واقعہ کہ حضرتِ رقیہؓ کے انتقال پر حضرت عثمانؓ سے حضرت اُمّ کلثومؓ کے نکاح کی پیش کش آنحضورؐ نے یہ کہہ کر کی ـــ "یہ جبریلؑ کھڑے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ اللہ نے اُمّ کلثومؓ کا نکاح عثمانؓ سے کر دیا ہے!" ـــ گویا جس طرح حضرتِ زینبؓ سے آنحضورؐ کا نکاح آسمان پر پہلے ہوا زمین پر بعد میں۔ اسی طرح حضرتِ اُمّ کلثومؓ سے بھی حضرتِ عثمانؓ کا نکاح اللہ نے پہلے پڑھایا، آنحضورؐ نے بعد میں۔ اور پھر جب حضرتِ اُمّ کلثومؓ بھی انتقال فرما گئیں تو آنحضورؐ نے فرمایا کہ اگر میری دس بیٹیاں ہوتیں تو میں اُن سب کو یکے بعد دیگرے عثمانؓ کے نکاح میں دیتا رہتا! ع:

"یہ نصیب اللہ اکبر لُوٹنے کی جائے ہے!"

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی گراں قدر تالیف "اِزالۃُ الخفاء عن

خلافۃ الخلفاء' میں حضرت عثمانؓ کے لقب "ذوالنورین" کے بارے میں بعض محققین کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اُنؓ کی شخصیت میں دو سخاوتوں کا نور جمع ہو گیا تھا، ایک آنحضورؐ پر ایمان لانے سے قبل کی سخاوت جو عبارت تھی صدقہ و خیرات اور غربا و مساکین کی اعانت و امداد سے اور دوسری ایمان لانے کے بعد کی سخاوت جس کا مظہر اتم تھا اللہ کے پیغام کی نشر و اشاعت اور اُس کے دین کی سربلندی کے لیے جہاد و قتال کے معارف میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا جسے قرآن حکیم انفاق فی سبیل اللہ بھی قرار دیتا ہے اور اللہ کے نام قرضِ حسنہ بھی! چنانچہ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ ایمان لانے کے بعد حضرت عثمانؓ کی شخصیت میں یہ دونوں سخاوتیں "نورٌ علیٰ نورٌ" کی کامل اکمل شان کے ساتھ جمع نظر آتی ہیں۔ نمونہ مُشتے از خروارے کے مصداق پہلی قسم کی سخاوت کے ضمن میں خود اُن کا یہ قول کفایت کرتا ہے کہ: "نبی اکرم کے دستِ مبارک پر بیعت کے بعد کوئی جمعہ مجھ پر ایسا نہیں گذرا جس میں میں نے کم از کم ایک غلام آزاد نہ کیا ہو۔ اگر اتفاقاً کسی ایک جمعہ کو اس کی صورت پیدا نہ ہو سکتی تو اگلے جمعے کو میں دو غلام آزاد کر دیتا تھا!" اور دوسری قسم کی سخاوت کی نہایت درخشاں مثال وہ ہے جو غزوۂ تبوک کے موقع پر جیشِ عُسرہ کی تیاری کے سلسلے میں سامنے آئی۔ کہ دس نہ بیس پورے تین سو اُونٹ مع کامل ساز و سامان اور ایک ہزار اشرفیاں نقد آنحضورؐ کی خدمت میں پیش کر کے اُنہوں نے وہ درجہ حاصل کر لیا جس سے اُوپر صرف ایک ہی مقام اور ہے، اور وہ ہے افضل البشر بعد الانبیاء بالتحقیق ابوبکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا! اور اِن دونوں قسم کی سخاوتوں کے ایک حسین امتزاج کی روشن مثال ہے ایک خطیر رقم کے عوض یہود سے بیرِ رُومہ کو خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کر دینا۔ فجزاہ اللہ عن جمیع المومنین والمسلمین خیر الجزاء۔

'ذوالنورین' کے لقب کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کی ذات میں 'صدیقیت' اور 'شہادت' کے دونوں انوار کا اجتماع بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک طرف آپ کی شخصیت میں سلامتیٔ عقل و فطرت، بِرّ و تقویٰ، خلقِ خدا پر رحمت و شفقت، اور حق و صداقت کی جانب پیش و قدمی و سبقت کے وہ تمام اوصاف بدرجۂ اتم موجود نظر آتے ہیں جو مرتبۂ صدیقیت کے لوازم ہیں اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے آپؓ کو شہادتِ عظمیٰ کی خلعتِ فاخرہ سے نوازا اور اس ضمن میں آپؓ نے صبر و ثبات، عزم و ہمت، اور مضبوط قوتِ ارادی کا وہ مظاہرہ فرمایا جس کی کوئی دوسری مثال نسلِ انسانی کی پوری تاریخ

پیش نہیں کر سکتی۔ یعنی یہ کہ رُوئے زمین کی عظیم ترین حکومت کے سربراہ ہونے کے باوجود جبکہ لاکھوں انسان آپؓ کے ادنیٰ سے اشارے پر گردنیں کٹوانے کے لیے تیار ہی نہیں بلکہ بیتاب تھے۔ جب آپؓ نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اپنی جان کے تحفظ اور اپنی ذات کے دفاع میں کسی ایک کلمہ گو کا خون بہانا بھی گوارا نہ کریں گے تو پھر اس پر اس طرح جم گئے کہ نہایت مظلومی کی حالت میں جان دینا گوارا کر لیا لیکن اپنے فیصلے سے سرِمُو انحراف نہیں فرمایا۔ جو لوگ حضرت عثمانؓ کو کمزور انسان قرار دیتے ہیں انہیں اپنی عقل کا ماتم کرنا چاہیے کہ کیا ایسی ہمالہ ایسی مضبوط قوتِ ارادی کے مالک انسان کو کمزور قرار دیا جا سکتا ہے ؎

جنوں کا نام خرد رکھ دیا، خرد کا جنوں جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے!

حضرت عثمانؓ کی مظلومانہ شہادت میں بھی دو انتہائی متضاد کیفیات کا اجتماع نظر آتا ہے۔ سورۂ کہف میں اللہ تعالیٰ نے اِن دو انتہائی اور باہم متضاد صورتوں کا ذکر فرمایا ہے جن سے اہلِ ایمان اِس دُنیا میں دوچار ہو سکتے ہیں: یعنی ایک اصحابِ کہف کی طرح جان بچانے کے لیے غار میں پناہ گزیں ہونے پر مجبور ہو جانا اور دوسری حضرت ذوالقرنین کی سی حکومت و سلطنت اور سطوت و شوکت کا مالک ہونا۔ حضرت عثمانؓ کے معاملے میں یہ دونوں صورتیں بیک وقت جمع ہو گئیں۔ چنانچہ ایک جانب اُن کے عہدِ خلافت میں مملکتِ اسلامی کا رُتبہ ذوالقرنین کی مملکت سے لگ بھگ تین گنا تھا اور دوسری طرف وہ مسلسل پچاس روز اپنے گھر میں اس طرح محصور رہے کہ مکمّل ناکہ بندی کر لی گئی تھی اور خوراک تو درکنار پانی تک اندر نہ جا سکتا تھا۔

اسی طرح حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں بھی دو متضاد کیفیات جمع نظر آتی ہیں۔ اُن سے پہلے حضرت عمرؓ کا عہد تھا جو غلبہ و استحکام، توسیع و ترقی، سطوت و شوکت، اور بلادِ اسلامی میں کامل امن و امان کے اعتبار سے دورِ خلافتِ راشدہ کے عہدِ زرّیں کی حیثیت رکھتا ہے اور اُن کے بعد حضرت علیؓ کا عہد تھا جس کے دوران فتنہ و فساد، تشتّت و انتشار اور مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی کا دَور دَورہ رہا۔ حضرت عثمانؓ کے دوازدہ سالہ عہدِ خلافت کے ابتدائی ۸ سال بالکل حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت کے مُشابہ ہیں اور آخری چار سالوں کے دوران اس فتنے نے سر اُٹھایا جو حضرت علیؓ کے عہد میں اپنے عُروج کو پہنچ گیا۔ لیکن واضح رہنا چاہیے کہ حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت کے آخری ایّام اور حضرت علیؓ کے پُورے عہدِ خلافت کے دوران جو

فتنہ و فساد نظر آتا ہے اُس کا اصل سبب اعدائے اسلام کی سازشیں اور ریشہ دوانیاں تھیں نہ کہ حضرت عثمانؓ یا حضرت علیؓ کی کوئی کمزوری یا کوتاہی۔ واقعہ یہ ہے کہ جن لوگوں نے اپنی تحقیق و تفتیش کا رُخ اِس طرف موڑا ہے انہوں نے اپنی اِس کاوش سے نہ علم کی خدمت کی ہے نہ دین کی، بلکہ چمنِ نبویؐ کے ان گلہائے سرسبد کی سیرتوں پر چھینٹے اُڑا کر انہوں نے اسلام پر بھی ظلم کیا ہے اور تاریخ اسلام پر بھی، اور خدمت اگر کی ہے تو صرف اور صرف اعدائے اسلام کی!

حضرت عثمانؓ کے لقب "ذُوالنّورین" ہی کا ایک پرتَو غالباً یہ بھی ہے کہ آپؓ دو ہجرتوں سے مشرف ہوئے یعنی ہجرتِ حبشہ سے بھی اور ہجرتِ مدینہ منوّرہ سے بھی، اور دو ہی بار ایسا ہوا کہ آپ کی عدم موجودگی کو آنحضورؐ نے موجودگی قرار دیا۔ یعنی ایک تو غزوۂ بدر کے موقع پر جب آپؓ آنحضورؐ کے حکم سے حضرت رُقیّہؓ کی تیمارداری کے باعث مدینہ منوّرہ ہی میں قیام پذیر رہے تھے لیکن آنحضورؐ نے آپ کو شریکِ بدر قرار دے کر مالِ غنیمت میں آپ کا حصّہ لگایا تھا اور دوسرے بیعتِ رضوان کے موقع پر جب آپؓ آنحضورؐ کے سفیر کی حیثیت سے مکّہ مکرّمہ تشریف لے گئے تھے اور آنحضورؐ نے اپنے ہی ایک ہاتھ کو حضرت عثمانؓ کا ہاتھ قرار دے کر ان کی جانب سے اپنے دستِ مبارک پر بیعت لی تھی! ؎

یہ رُتبۂ بلند مِلا جس کو مِل گیا — ہر مدّعی کے واسطے دار و رسن کہاں!

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ۝ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

کراچی میں

مرکزی **انجمن خدّام القرآن** لاہور

کے ذیلی دفتر کے لئے سنّی پلازا عقب مکلوڈ روڈ
میں جگہ حاصل کر لی گئی ہے جو ابھی زیرِ تعمیر ہے۔
فی الحال کراچی میں انجمن اور مکتبۂ انجمن کا پتہ حسبِ ذیل ہے:

قاضی عبدالقادر ۲/۲ A V ناظم آباد (فون نمبر: ۶۱۳۲۷۷)

تحریح انتخاب

اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اغلباً ۱۹۴۰ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں مندرجہ بالا موضوع پر ایک فکر انگیز مقالہ پڑھا تھا۔ جو بعدہٗ مختلف طریقوں سے کثیر تعداد میں شائع ہو کر اہلِ علم و دانش میں پھیلا۔ اِس مقالے میں اسلامی حکومت کے قیام کے لیے عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ جو طریقِ کار پیش کیا گیا تھا، اُسی پر "جماعتِ اسلامی" کی اصلاً تاسیس ہوئی تھی۔ اس معرکۃ الآراء مضمون کا ایک اہم اقتباس قارئینِ 'میثاق' کی خدمت میں پیش ہے (ج۔ ر مرتّب)

اسلام دراصل اس تحریک کا نام ہے جو خدائے واحد کی حاکمیت کے نظریّہ پر انسانی زندگی کی پوری عمارت تعمیر کرنا چاہتی ہے۔ یہ تحریک قدیم ترین زمانے سے ایک ہی بنیاد اور ایک ہی ڈھنگ پر چلی آرہی ہے۔ اس کے لیڈر وہ لوگ تھے جن کو رسُل اللہ (اللہ کے فرستادے) کہا جاتا ہے ہمیں اگر اس تحریک کو چلانا ہے تو لامحالہ اُن ہی لیڈروں کے طرزِ عمل کی پیروی کرنی ہوگی کیونکہ اس کے سوا کوئی اور طرزِ عمل اس خاص نوعیت کی تحریک کے لیے نہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے اس سلسلہ میں جب ہم انبیاء علیہم السّلام کے نقشِ قدم کا سراغ لگانے کے لیے نکلتے ہیں تو ہمیں ایک بڑی دقّت کا سامنا ہوتا ہے۔ قدیم زمانے میں جو انبیاء گزرے ہیں اُن کے کام کے متعلق ہمیں کچھ زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ قرآن میں کچھ مختصر اشارات ملتے ہیں مگر اُن سے مکمل اسکیم نہیں بن سکتی۔ بائبل کے عہدِ جدید (NEW TESTAMENT) میں سیّدنا مسیح علیہ السّلام کے کچھ غیر مستند اقوال ملتے ہیں، جن سے کسی حد تک اس پہلو پر روشنی پڑتی ہے کہ اسلامی تحریک اپنے بالکل ابتدائی مرحلہ میں کس طرح چلائی جاتی ہے، اور کن مسائل سے اُسے سابقہ پیش آتا ہے لیکن بعد کے مراحل حضرت مسیح کو پیش ہی نہیں آئے کہ اُن کے متعلق کوئی اشارہ وہاں سے مل سکے۔ اس معاملہ میں ہم کو صرف ایک ہی جگہ سے صاف اور مکمل رہنمائی ملتی ہے۔

اور وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے۔ اس طرف ہمارے رجوع کرنے کی وجہ نری عقیدت مندی ہی نہیں ہے بلکہ دراصل اس راہ کے نشیب و فراز معلوم کرنے کے لیے ہم اسی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہیں۔ اسلامی تحریک کے تمام لیڈروں میں صرف ایک محمد صلی اللہ علیہ وسلم وہ تنہا لیڈر ہیں جن کی زندگی میں ہم کو اس تحریک کی ابتدائی دعوت سے لے کر اسلامی اسٹیٹ کے قیام تک اور قیام کے بعد اس اسٹیٹ کی شکل، دستور، داخلی و خارجی پالیسی اور نظم مملکت کے نہج تک ایک ایک مرحلے اور ایک ایک پہلو کی پوری تفصیلات اور نہایت مستند تفصیلات ملتی ہیں۔ لہٰذا میں اسی ماخذ سے اس تحریک کے طریق کار کا ایک مختصر نقشہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اسلام کی دعوت پر مامور ہوئے ہیں تو آپ کو معلوم ہے کہ دنیا میں بہت سے اخلاقی، تمدنی، معاشی اور سیاسی مسائل حل طلب تھے۔ رومی اور ایرانی امپریلزم بھی موجود تھا۔ طبقاتی امتیازات بھی تھے۔ ناجائز معاشی انتفاع (ECONOMIC EXPLOITATION) بھی ہو رہا تھا، اخلاقی ذمائم بھی پھیلے ہوئے تھے۔ خود آپ کے اپنے ملک میں ایسے پیچیدہ مسائل موجود تھے جو ایک لیڈر کے ناخنِ تدبیر کا انتظار کر رہے تھے۔ ساری قوم جہالت، اخلاقی پستی، افلاس، طوائف الملوکی اور خانہ جنگی میں مبتلا تھی۔ یمن تک عرب کے تمام ساحلی علاقے عراق کے زرخیز صوبے سمیت ایرانی تسلط میں تھے۔ شمال میں عین حجاز کی حد تک رومی تسلط پہنچ چکا تھا۔ خود حجاز میں یہودی سرمایہ داروں کے بڑے بڑے گروہ بنے ہوئے تھے اور انہوں نے عربوں کو اپنی سود خوری کے جال میں پھانس رکھا تھا۔ مشرقی ساحل کے عین مقابل حبش کی عیسائی حکومت موجود تھی جو چند ہی سال پہلے مکہ پر چڑھائی کر چکی تھی۔ اس کے ہم مذہب اور اس سے ایک گونہ معاشی و سیاسی تعلق رکھنے والوں کا ایک جتھا خود حجاز اور یمن کے درمیان نجران کے مقام پر موجود تھا۔ یہ سب کچھ تھا، مگر جس لیڈر کو اللہ نے رہنمائی کے لیے مقرر کیا تھا اس نے دنیا کے اور خود اپنے ملک کے ان بہت سے مسائل میں سے کسی ایک مسئلہ کی طرف بھی توجہ نہ کی۔ بلکہ دعوت اس چیز کی طرف دی کہ خدا کے سوا تمام الٰہوں کو چھوڑ دو، اور صرف اُسی ایک الٰہ کی بندگی قبول کرو۔

اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اس رہنما کی نگاہ میں دوسرے مسائل کوئی اہمیت نہ رکھتے تھے یا وہ کسی توجہ کے لائق ہی نہ تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ آگے چل کر اس نے ان سب مسئلوں کی طرف توجہ کی، اور سب کو ایک ایک کر کے حل کیا مگر ابتداء میں سب طرف سے نظر پھیر کر اسی ایک چیز

پر تمام زور صرف کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اسلامی تحریک کے نقطۂ نظر سے انسان کی اخلاقی و تمدنی زندگی میں جتنی خرابیاں بھی پیدا ہوتی ہیں اُن سب کی بنیادی علت انسان کا اپنے آپ کو خود مختار اور غیر ذمہ دار سمجھنا۔ بالفاظِ دیگر آپ اپنا الٰہ بنتا ہے، یا پھر یہ ہے کہ وہ الٰہ العالمین کے سوا کسی دوسرے کو صاحبِ امر تسلیم کرے۔ خواہ دوسرا کوئی انسان ہو یا غیر انسان۔ یہ چیز عبب تک جڑ میں موجود ہے اسلامی نظریہ کی رُو سے کوئی اوپری اصلاح، انفرادی بگاڑ یا اجتماعی خرابیوں کو دور کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ایک طرف سے خرابی کو دُور کیا جائے گا اور کسی دوسری طرف سے وہ سر نکال لے گی۔ لہٰذا اصلاح کا آغاز اگر ہو سکتا ہے تو صرف اسی چیز سے ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو انسان کے دماغ سے خود مختاری کی ہوا کو نکالا جائے اور اسے بتایا جائے کہ تو جس دنیا میں رہتا ہے، وہ درحقیقت بے بادشاہ کی سلطنت نہیں ہے بلکہ فی الواقع اس کا ایک بادشاہ موجود ہے، اور اُس کی بادشاہی نہ تیرے تسلیم کرنے کی محتاج ہے، نہ تیرے مٹانے سے مٹ سکتی ہے، نہ تو اس کے حُدودِ سلطنت سے نکل کر کہیں جا سکتا ہے۔ اس امٹ اور اٹل واقعہ کی موجودگی میں تیرا خود مختاری کا زعم ایک احمقانہ غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں ہے جس کا نقصان لامحالہ تیرے ہی اوپر عاید ہوگا۔ عقل اور حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ سیدھی طرح اس کے آگے سر جھکا دے اور مطیع بندہ بن کر رہ۔ دوسری طرف اس کو واقعہ کا یہ پہلو بھی دکھا دیا جائے کہ اِس پُوری کائنات میں صرف ایک ہی بادشاہ، ایک ہی مالک اور ایک ہی مختار ہے۔ کسی دوسرے کو نہ یہاں حکم چلانے کا حق ہے اور نہ واقع میں کسی کا حکم چلتا ہے۔ اِس لیے تو اُس کے سوا کسی کا بندہ نہ بن، کسی کا حکم نہ مان کسی کے آگے سر نہ جھکا۔ یہاں کوئی ہز میجسٹی نہیں ہے۔ ہز میجسٹی اسی ایک کے لیے مختص ہے۔ یہاں کوئی ہز ہولی نس نہیں ہے۔ ہولی نس ساری کی ساری اسی ایک کے لیے خاص ہے۔ یہاں کوئی ہز ہائی نس نہیں ہے۔ ہائی نس صرف اُسی ایک کو زیبا ہے۔ یہاں کوئی ہز لارڈ شپ نہیں ہے۔ لارڈ شپ بالکلیہ اُسی ایک کا حصہ ہے۔ یہاں کوئی قانون ساز نہیں ہے، قانون اُسی کا ہے اور وہی قانون بنانے کا حقدار و سزاوار ہے۔ یہاں کوئی سرکار، کوئی اَن داتا، کوئی راجہ مہاراجہ، کوئی ولی و کارساز، کوئی دعائیں سُننے والا اور فریاد رس نہیں ہے۔ کسی کے پاس اقتدار کی کنجیاں نہیں ہیں، کسی کو برتری و فوقیت حاصل نہیں ہے۔ زمین سے آسمان تک سب بندے ہی بندے ہیں۔ رب اور مولیٰ صرف ایک ہے، لہٰذا تو ہر غلامی، ہر اطاعت، ہر پابندی سے انکار کر دے اور اُسی ایک کا غلام، مطیع اور

پابندِ حکم بن جا- یہ تمام اصلاحات کی جڑ اور بنیاد ہے- اسی بنیاد پر انفرادی سیرت اور اجتماعی نظام کی پوری عمارت اُدھیڑ کر از سرِ نَو ایک نقشہ پر بنتی ہے اور سارے مسائل جو انسانی زندگی میں آدمؑ سے لے کر اب تک پیدا ہوئے اور اب سے قیامت تک پیدا ہوں گے اسی بنیاد پر ایک نئے طریقے سے حل ہوتے ہیں-

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بنیادی اصلاح کی دعوت کو بغیر کسی سابق تیاری اور بغیر کسی تمہیدی کارروائی کے براہِ راست پیش کر دیا- انہوں نے اِس دعوت کی منزل تک پہنچنے کے لیے کوئی ایرپھیر کا راستہ اختیار نہ کیا کہ پہلے کچھ سیاسی اور سوشل طرز کا کام کر کے لوگوں میں اثر پیدا کیا جائے پھر اس اثر سے کام لے کر کچھ حاکمانہ اختیارات حاصل کئے جائیں- پھر ان اختیارات سے کام لے کر رفتہ رفتہ لوگوں کو چلاتے ہوئے اس مقام تک بڑھا لائیں، یہ سب کچھ، کچھ نہیں- ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں ایک شخص اٹھا اور چھوٹتے ہی اُس نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ط کا اعلان کر دیا- اِس سے کم کسی چیز پر اس کی نظر ایک لمحہ کے لیے بھی نہ ٹھہری- اس کی وجہ پیغمبرانہ جرأت اور تبلیغی جوش ہی نہیں ہے، در اصل اسلامی تحریک کا طریق کار یہی ہے- وہ اثر یا وہ نفوذ و اقتدار جو دوسرے ذرائع سے پیدا کیا جائے اس اصلاح کے کام میں کچھ بھی مددگار نہیں ہوتا- جو لوگ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ط کے سوا کسی اور بنیاد پر آپ کا ساتھ دیتے رہے ہیں وہ اس بنیاد پر تعمیرِ جدید کرنے میں آپ کے کسی کام نہیں آ سکتے- اِس کام میں تو وہی لوگ مفید ہو سکتے ہیں جو آپ کی طرف لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کی آواز سُن کر ہی آئیں- اِسی چیز میں اُن کے لیے کشش ہو- اسی حقیقت کو وہ زندگی کی بنیاد بنائیں اور اسی اساس پر وہ کام کرنے کے لیے اُٹھیں- لہٰذا اسلامی تحریک چلانے کے لیے جس خاص قسم کے تدبّر اور حکمتِ عملی کی ضرورت ہے، اس کا تقاضا یہی ہے کہ کسی تمہید کے بغیر کام کا آغاز اسی توحید کی دعوت سے کیا جائے-

توحید کا یہ تصوّر محض ایک مذہبی عقیدہ نہیں ہے، جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں اس سے اجتماعی زندگی کا وہ پورا نظام جو انسان کی خود مختاری یا غیر اللہ کی حاکمیّت و اُلوہیّت کی بنیاد پر بنا ہو، جڑ بنیاد سے اُکھڑ جاتا ہے- اور ایک دوسری اساس پر ایک نئی عمارت تیار ہوتی ہے- آج دنیا آپ کے مؤذنوں کو اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ط کی صدا بلند کرتے ہوئے اِس لیے ٹھنڈے پیٹوں سُن لیتی ہے کہ نہ پکارنے والا جانتا ہے کہ کیا پکار رہا ہوں، نہ سننے والوں کو اس میں کوئی معنی اور مقصد نظر آتا ہے- لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس اعلان کا مقصد یہ ہے

اور اعلان کرنے والا جان بُوجھ کر اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ میرا کوئی بادشاہ یا فرمانروا نہیں ہے۔ کوئی حکومت میں تسلیم نہیں کرتا، کسی قانون کو میں نہیں مانتا، کسی عدالت کے حدود و اختیارات مجھ تک نہیں پہنچتے، کسی کا حکم میرے لیے حکم نہیں ہے، کوئی رواج اور کوئی رسم مجھے تسلیم نہیں۔ کسی کے امتیازی حقوق، کسی کی ریاست، کسی کا تقدس، کسی کے اختیارات میں نہیں مانتا۔ ایک اللہ کے سوا میں سب سے باغی اور سب سے منحرف ہوں، تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس صدا کو کہیں بھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ آپ خواہ کسی سے لڑنے جائیں یا نہ جائیں دنیا خود آپ سے لڑنے آجائے گی۔ یہ آواز بلند کرتے ہی آپ کو یوں محسوس ہوگا کہ یکایک زمین و آسمان آپ کے دشمن ہوگئے ہیں، اور ہر طرف آپ کے لیے سانپ بچھو اور درندے ہی درندے ہیں

یہی صورت اُس وقت پیش آئی جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آواز بلند کی۔ پکارنے والے نے جان کر پکارا تھا اور سُننے والے سمجھتے تھے کہ کیا پکار رہا ہے۔ اس لیے جس جس پر جس پہلو سے بھی اُس پکار کی ضرب پڑتی تھی وہ اُس آواز کو دبانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ پجاریوں کو اپنی پنڈتیت و پاپائیت کا خطرہ اُس میں نظر آیا۔ رئیسوں کو اپنی ریاست کا، ساہوکاروں کو اپنی ساہوکاری کا، نسل پرستوں کو اپنے نسلی تفوّق کا، قوم پرستوں کو اپنی قومیت کا، اجداد پرستوں کو اپنے باپ دادا کے موروثی طریقہ کا۔ غرض ہر بُت کے پرستار کو اپنے بُت کے ٹوٹنے کا خطرہ اسی ایک آواز میں محسوس ہوا۔ اس لیے کہ: اَلْكُفْرُ مِلَّةٌ وَّاحِدَةٌ؎ وہ سب جو آپس میں لڑا کرتے تھے اس نئی تحریک سے لڑنے کے لیے ایک ہوگئے۔ اس حالت میں صرف وہی لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آئے جن کا ذہن صاف تھا، جو حقیقت کو سمجھنے اور تسلیم کرنے کی استعداد رکھتے تھے۔ جن کے اندر اتنی صداقت پسندی موجود تھی کہ جب ایک چیز کے متعلق جان لیں کہ حق یہ ہے تو اس کی خاطر آگ میں کودنے اور موت سے کھیلنے کے لیے تیار ہوجائیں۔ ایسے ہی لوگوں کی اس تحریک کے لیے ضرورت تھی۔ وہ ایک ایک، دو دو، چار چار کرکے آتے رہے اور کشمکش بڑھتی رہی، کسی کا روزگار چھوٹا، کسی کو گھروالوں نے نکال دیا، کسی کے عزیز دوست آشنا سب چھوٹ گئے، کسی پر مار پڑی، کسی کو قید میں ڈالا گیا، کسی کو تپتی ہوئی ریت پر گھسیٹا گیا، کسی کی سرِ بازار پتھروں اور گالیوں سے تواضع کی گئی، کسی کی آنکھ پھوڑ دی گئی، کسی کا سر پھوڑ دیا گیا، کسی کو عورت، مال، حکومت و ریاست اور ہر میٹھی چیز کا لالچ دے کر خریدنے کی کوشش کی گئی۔ یہ سب چیزیں آئیں، ان کا آنا ضروری تھا، اِن کے بغیر اسلامی تحریک نہ مستحکم ہوسکتی اور نہ بڑھ سکتی تھی۔

ان کا پہلا فائدہ یہ تھا کہ گھٹیا قسم کے کچے کیریکٹر اور ضعیف ارادہ رکھنے والے لوگ اس طرف آ ہی نہ سکتے تھے۔ جو بھی آیا وہ نسلِ آدم کا بہترین جوہر تھا جس کی دراصل ضرورت تھی۔ کوئی دوسری صورت کام کے آدمیوں کو ناکارہ آدمیوں سے چھانٹ کر الگ نکال لینے کی اِس کے سوا نہ تھی کہ جو بھی آئے وہ اِس بھٹی میں سے گزر کر آئے۔

پھر جو لوگ آئے اُن کو اپنی کسی ذاتی غرض کے لیے یا کسی خاندانی یا قومی مقصد کے لیے مصائب کا مقابلہ نہیں کرنا پڑا، بلکہ صرف حق اور صداقت کے لیے خدا اور اُس کی رضا کے لیے اِسی کے لیے وہ پٹے، اِسی کے لیے وہ بھوکے مرے، اِسی کے لیے دُنیا بھر کی جفا کاریوں کا تختۂ مشق بنے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں وہ صحیح اسلامی ذہنیت پیدا ہوتی چلی گئی جس کی ضرورت تھی۔ ان کے اندر خالص اسلامی کیریکٹر پیدا ہوا۔ ان کی خدا پرستی میں خلوص آتا اور بڑھتا چلا گیا۔ مصائب کی اس زبردست تربیت گاہ میں کیفیتِ اسلامی کا طاری ہونا ایک طبعی امر تھا۔ جب کوئی شخص کسی مقصد کے لیے اٹھتا ہے اور اس کی راہ میں کشمکش، جدوجہد، مصیبت، تکلیف، پریشانی، قید، فاقہ، جلا وطنی وغیرہ کے مرحلوں سے گزرتا ہے تو اس ذاتی تجربہ کی بدولت اس مقصد کی تمام کیفیات اس کے قلب و روح پر چھا جاتی ہیں۔ اور اس کی پوری شخصیت اس مقصد میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس چیز کی تکمیل میں مدد دینے کے لیے نماز ان پر فرض کی گئی تاکہ نظر کی پراگندگی کا ہر امکان دور ہو جائے۔ اپنے نصب العین پر ان کی نگاہ جمی رہے جس کو وہ حاکم مان رہے ہیں، اس کی حاکمیت کا بار بار اقرار کر کے اپنے عقیدے میں مضبوط ہو جائیں جس کے حکم کے مطابق انہیں اب دنیا میں کام کرنا ہے۔ اس کا "عالم الغیب والشہادۃ" ہونا۔ اُس کا "مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" ہونا، اُس کا "قَاهِرٌ فَوْقَ عِبَادِهٖ" ہونا، پوری طرح اُن کے ذہن نشین ہو جائے اور کسی حال میں اُس کی اطاعت کے سوا دوسرے کی اطاعت کا خیال تک اُن کے دلوں میں نہ آنے پائے۔

ایک طرف آنے والوں کی تربیت اس طرح ہو رہی تھی اور دوسری طرف اسی کشمکش کی وجہ سے اسلامی تحریک پھیل بھی رہی تھی۔ جو لوگ دیکھتے تھے کہ چند انسان پیٹے جا رہے ہیں، قید کیے جا رہے ہیں، گھروں سے نکالے جا رہے ہیں، تو خواہ مخواہ اُن کے اندر یہ معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوتا تھا، کہ آخر یہ سارا ہنگامہ ہے کس لیے؟ اور جب انہیں یہ معلوم ہوتا تھا کہ زن، زر، زمین کسی چیز کے لیے بھی نہیں ہے، کوئی اُن کی ذاتی غرض نہیں ہے یہ اللہ کے

بندے صرف اس لیے پٹ رہے ہیں کہ ایک چیز کی صداقت اُن پر منکشف ہوئی ہے، تو اُن کے دلوں میں آپ سے آپ یہ جذبہ پیدا ہوتا تھا کہ اس چیز کو معلوم کریں۔ آخر ایسی کیا چیز ہے جس کے لیے یہ لوگ ایسے ایسے مصائب برداشت کر رہے ہیں؟ پھر جب انہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ چیز ہے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ط اور اس سے انسانی زندگی میں اس نوعیت کا انقلاب رُونما ہوتا ہے اور دعوت لے کر ایسے لوگ اُٹھے ہیں جو محض صداقت و حقیقت کی خاطر دُنیا کے سارے فائدوں کو ٹھکرا رہے ہیں۔ اور جان، مال، اولاد، ہر چیز کو قربان کر رہے ہیں تو اُن کی آنکھیں کھل جاتی تھیں۔ ان کے دلوں پر جتنے پردے پڑے ہوئے تھے، وہ چاک ہونے لگتے تھے۔ اس پس منظر کے ساتھ یہ سچّائی تیر کی طرح نشانے پر جا بیٹھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بجز اُن لوگوں کے جن کو ذاتی وجاہت کے تکبّر یا اجداد پرستی کی جہالت یا اغراضِ دُنیوی کی محبّت نے اندھا بنا رکھا تھا اور سب لوگ اس تحریک کی طرف کھنچتے چلے گئے۔ کوئی جلدی کھنچا اور کوئی زیادہ دیر تک اس کشش کی مزاحمت کرتا رہا، مگر دیر یا سویر ہر صداقت پسند، بے ثوث آدمی کو اس کی طرف کھنچنا ہی پڑا۔

اِس دَوران میں تحریک کے لیڈر نے اپنی شخصی زندگی سے اپنی تحریک کے اُصُولوں کا اور ہر اُس چیز کا جس کے لیے یہ تحریک اُٹھی تھی، پُورا پُورا مظاہرہ کیا۔ اُن کی ہر بات، ہر فعل اور ہر حرکت سے اسلام کی حقیقی رُوح ٹپکتی تھی اور آدمی کی سمجھ میں آتا تھا کہ اسلام کسے کہتے ہیں یہ ایک بڑی تفصیل طلب بحث ہے جس کی تشریح کا یہاں موقع نہیں مگر مختصراً چند نمایاں باتوں کا مَیں یہاں ذکر کروں گا۔

اُن کی بیوی حضرت خدیجہؓ حجاز کی سب سے زیادہ مالدار عورت تھیں اور وہ ان کے مال سے تجارت کرتے تھے۔ جب اسلام کی دعوت شروع ہوئی تو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا سارا تجارتی کاروبار بیٹھ گیا۔ کیونکہ ہمہ تن اپنی دعوت میں مصروف ہو جانے اور تمام عرب کو اپنا دشمن بنا لینے کے بعد یہ کام نہ چل سکتا تھا۔ جو کچھ پھیلا اندوختہ تھا اُس کو میاں اور بیوی دونوں نے اس تحریک کے پھیلانے پر چند سال میں لُٹا دیا۔ آخر کار نوبت یہاں تک آئی کہ جب آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم اپنی تبلیغ کے سلسلہ میں طائف تشریف لے گئے تو وہ شخص جو کبھی حجاز کا ملکُ التجّار تھا اُس کی سواری کے لیے ایک گدھا تک میسّر نہ ہوا۔

قریش کے لوگوں نے آنحضرتؐ کے سامنے حجاز کی حکومت کا تخت پیش کیا۔ کہا کہ ہم تم کو اپنا

بادشاہ بنا لیں گے۔ عرب کی حسین ترین عورت آپ کے نکاح میں دیں گے۔ دولت کے ڈھیر آپ کے قدموں میں لگا دیں گے، بشرطیکہ آپ اس تحریک سے باز آجائیں۔ مگر وہ شخص جو انسان کی فلاح کے لیے اٹھا تھا اُس نے اِن سب پیش کشوں کو ٹھکرا دیا اور گالیاں اور پتھر کھانے پر راضی ہو گیا۔

قریش کے اور عرب کے سرداروں نے کہا کہ محمدؐ! ہم تمہارے پاس کیسے آکر بیٹھیں اور تمہاری باتیں کیسے سُنیں جب کہ تمہاری مجلس میں ہر وقت غلام، مفلس، معاذ اللہ کمین لوگ بیٹھے رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو سب سے نیچے طبقے کے لوگ ہیں ان کو تم نے اپنے گرد و پیش جمع کر رکھا ہے، انھیں ہٹاؤ تو ہم تم سے ملیں۔ مگر وہ شخص جو انسانوں کی اونچ نیچ برابر کرنے آیا تھا، اُس نے رئیسوں کی خاطر غریبوں کو دھتکارنے سے انکار کر دیا۔

اپنی تحریک کے سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ملک، اپنی قوم، اپنے قبیلے، اپنے خاندان، کسی کے مفاد کی کبھی پروا نہیں کی۔ اسی چیز نے دُنیا کو یقین دلایا کہ آپ انسان بحیثیت انسان کی فلاح کے لیے اُٹھے ہیں اور اسی چیز نے آپؐ کی دعوت کی طرف ہر قوم کے انسانوں کو کھینچا۔ اگر آپؐ اپنے خاندان کی فکر کرتے تو غیر ہاشمیوں کو اس فکر سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ اگر آپ اس بات کے لیے بے چین ہوتے کہ قریش کے اقتدار کو تو کسی طرح بچا لوں تو غیر قریشی عربوں کو کیا پڑی تھی کہ اس کام میں شریک ہوتے؟ اگر آپ عرب کی برتری کے لیے اُٹھتے تو حبش کے بلالؓ، رُوم کے صہیبؓ اور فارس کے سلمانؓ کو کیا غرض پڑی تھی کہ اس کام میں آپ کا ساتھ دیتے؟ دراصل جس چیز نے سب کو کھینچا وہ خالص خدا پرستی تھی۔ ہر ذاتی، خاندانی، قومی، وطنی غرض سے مکمل بے لوثی تھی۔

مکّہ سے جب آپؐ کو ہجرت کرنی پڑی تو وہ تمام امانتیں جو دشمنوں نے آپؐ کے پاس رکھوائی تھیں، حضرت علیؓ کے سپرد کر کے نکلے کہ میرے بعد ہر ایک کی امانت اس کو پہنچا دینا۔ دُنیا پرست ایسے موقع پر جو کچھ ہاتھ لگتا ہے، لے کر چلتے ہیں۔ مگر خدا پرست نے اپنی جان کے دشمنوں اپنے خون کے پیاسوں کا مال بھی انہیں واپس پہنچانے کی کوشش کی، اور اُس وقت کی جب وہ اُس کے قتل کا فیصلہ کر چکے تھے۔ یہ وہ اخلاق تھا جس کو دیکھ کر عرب کے لوگ دنگ رہ گئے ہوں گے اور مجھے یقین ہے کہ جب وہ دو سال کے بعد میدانِ بدر میں آنحضرتؐ کے خلاف لڑنے کھڑے ہوئے ہوں گے تو اُن کے دل اندر سے کہہ رہے ہوں گے کہ یہ تم کس سے لڑ رہے ہو؟ اُس فرشتہ خصلت انسان سے جو قتل گاہ سے رخصت ہوتے وقت بھی انسانوں کے حقوق اور امانت

کی ذمّہ داری کو نہیں بھولتا؟ اُس وقت اُن کے ہاتھ ضد کی بنا پر لڑتے ہوں گے مگر اُن کے دل اندر سے بھیج رہے ہوں گے۔ عجب نہیں کہ بدر میں کفّار کی شکست کے اخلاقی اسباب میں سے یہ بھی ایک سبب ہو۔

تیرہ برس کی شدید جدّوجُہد کے بعد وہ وقت آیا جب مدینہ میں اسلام کا ایک چھوٹا سا اسٹیٹ قائم کرنے کی نوبت آئی۔ اُس وقت ڈھائی تین سَو کی تعداد میں ایسے کارکُن فراہم ہو چکے تھے، جن میں سے ایک ایک اسلام کی پُوری تربیت پاکر اس قابل ہو چکا تھا کہ جس حیثیّت میں بھی اُسے کام کرنے کا موقع ملے، مسلمان کی حیثیّت سے انجام دے سکے۔ اب یہ لوگ ایک اسلامی اسٹیٹ کو چلانے کے لیے تیار تھے، چنانچہ وہ قائم کر دیا گیا۔ دس برس تک رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس اسٹیٹ کی رہنمائی کی اور اس مختصر سی مدّت میں ہر شعبۂ حکومت کو اسلامی طرز پر چلانے کی پُوری مشق ان لوگوں کو کرا دی۔ یہ دَورِ اسلامی آئیڈیالوجی کے ایک مجرّد تخیّل (ABSTRACT IDEA) سے ترقّی کر کے ایک مکمّل نظامِ تمدّن بننے کا دَور ہے، جس میں اسلام کی انتظامی، تعلیمی، عدالتی، معاشی، معاشرتی، مالی، جنگی، بین الاقوامی پالیسی کا ایک ایک پہلو واضح ہوا۔ ہر شعبۂ زندگی کے لیے اُصُول بنے۔ اِن اُصُولوں کو عملی حالات پر منطبق کیا گیا۔ اس خاص طرز پر کام کرنے والے کارکن تعلیم اور تربیت اور عملی تجربہ سے تیار کیے گئے۔ اور ان لوگوں نے اسلام کی حکمرانی کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ آٹھ سال کی مختصر مدّت میں مدینہ جیسے ایک چھوٹے سے قصبہ کا اسٹیٹ پورے عرب کی سلطنت میں تبدیل ہو گیا۔ جُوں جُوں لوگ اسلام کو اُس کی عملی صورت میں اور اُس کے نتائج کو محسوس شکل میں دیکھتے تھے۔ خود بخود اس بات کے قائل ہوتے جاتے تھے کہ فی الواقع انسانیت اس کا نام ہے اور انسانی فلاح اسی چیز میں ہے۔ بدترین دشمنوں کو بھی آخر قائل ہو کر اسی مسلک کو قبول کرنا پڑا، جس کے خلاف وہ برسوں تک لڑتے رہے۔ خالد بن ولید قائل ہوئے، ابوجہل کے بیٹے عکرمہ قائل ہوئے، ابوسفیان قائل ہوئے، قاتلِ حمزہؓ وحشی قائل ہوئے، ہندہ جگر خوار تک کو آخر کار اس شخص کی صداقت کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینا پڑا جس سے بڑھ کر اُس کی نگاہ میں کوئی مبغوض نہ تھا۔

غلطی سے تاریخ نگاروں نے غزوات کو اتنا نمایاں کر دیا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ عرب کا یہ انقلاب لڑائیوں سے ہوا۔ حالانکہ ۲۳ سال کی تمام لڑائیوں میں، جن سے عرب جیسی جنگجو قوم متاثر ہوئی، طرفین کے جانی نقصانات کی تعداد ہزار بارہ سَو سے زیادہ نہیں ہے۔ انقلابات کی تاریخ اگر آپ کے پیشِ نظر ہے تو آپ کو تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ انقلاب غیر خونی انقلاب کہے جانے کا مستحق

ہے۔ پھر اس انقلاب میں فقط ملک کا طریقِ انتظام ہی تبدیل نہیں ہوا بلکہ ذہنیتیں بدل گئیں، نگاہ کا زاویہ بدل گیا، سوچنے کا طریقہ بدل گیا، زندگی کا طرز بدل گیا، اخلاق کی دنیا بدل گئی، عادات اور خصائل بدل گئے، غرض ایک پوری قوم کی کایا پلٹ کر رہ گئی۔ جو زانی تھے وہ عورتوں کی عصمت کے محافظ بن گئے، جو شرابی تھے وہ منعِ شراب کی تحریک کے علم بردار بن گئے، جو چور اور اُچکے تھے ان کا احساسِ دیانت اتنا نازک ہوگیا کہ دوستوں کے گھر کھانا کھانے میں بھی اُن کو اس بنا پر تأمل تھا کہ مبادا ناجائز طریقہ پر مال کھانے کا اطلاق اِس فعل پر بھی نہ ہوجائے۔ حتیٰ کہ قرآن میں خود اللہ تعالیٰ کو انھیں اطمینان دلانا پڑا کہ اس طرح کے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ جو ڈاکو اور لٹیرے تھے وہ اتنے متدیّن بن گئے کہ اُن کے ایک معمولی سپاہی کو پایۂ تخت ایران کی فتح کے موقع پر کروڑوں کی قیمت کا تاجِ شاہی ہاتھ لگا اور وہ رات کی تاریکی میں اپنے پیوند لگے ہوئے کمبل میں اُسے چھپا کر سپہ سالار کے حوالے کرنے کے لیے پہنچا تاکہ اس غیر معمولی واقعہ سے اُس کی دیانت کی شہرت نہ ہوجائے اور اُس کے خلوص پر ریاکاری کا میل نہ آجائے۔ وہ جن کی نگاہ میں انسانی جان کی کوئی قیمت نہ تھی، جو اپنی بیٹیوں کو آپ اپنے ہاتھ سے زندہ دفن کرتے تھے، اُن کے اندر جان کا اتنا احترام پیدا ہوگیا کہ کسی مرغ کو بھی بے رحمی سے قتل ہوتے نہ دیکھ سکتے تھے۔ وہ جن کو راست بازی اور انصاف کی ہَوا تک نہ لگی تھی، اُن کے عدل اور راستی کا یہ حال ہوگیا کہ خیبر کی صلح کے بعد جب اُن کا تحصیلدار یہودیوں سے سرکاری معاملہ وصول کرنے گیا تو یہودیوں نے اُس کو بطور رشوت قرار رقم اس غرض کے لیے پیش کی کہ وہ سرکاری مطالبہ میں کچھ کمی کردے مگر اُس نے رشوت لینے سے انکار کردیا اور یہودیوں کے درمیان پیداوار کا آدھا حصّہ اس طرح تقسیم کیا کہ دو برابر کے ڈھیر آمنے سامنے لگا دیئے اور یہودیوں کو اختیار دیا کہ دونوں میں سے جس ڈھیر کو چاہیں اٹھالیں۔ اس نرالی قسم کے تحصیلدار کا یہ طرزِ عمل دیکھ کر یہودی انگشت بدنداں رہ گئے اور بے اختیار اُن کی زبان سے نکلا کہ اسی عدل پر زمین و آسمان قائم ہیں۔ اُن کے اندر وہ گورنر پیدا ہوئے جو گورنمنٹ ہاؤسوں میں نہیں بلکہ رعایا کے درمیان انہی جیسے گھروں میں رہتے تھے، بازاروں میں پیدل پھرتے تھے، دروازوں پر دربان تک نہ رکھتے تھے۔ رات دن میں ہر وقت جو چاہتا تھا اُن سے انٹرویو کرسکتا تھا۔ اُن کے اندر وہ قاضی پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے ایک یہودی کے خلاف خود خلیفۂ وقت کا دعویٰ اس بنا پر خارج کردیا کہ خلیفہ اپنے غلام اور اپنے بیٹے کے سوا کوئی گواہ پیش نہ کرسکا۔ اُن کے اندر

وہ سپہ سالار پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے دورانِ جنگ میں ایک شہر خالی کرتے وقت پورا جزیہ یہ کہہ کر واپس دے دیا کہ ہم اب تمہاری حفاظت سے قاصر ہیں۔ لہٰذا جو ٹیکس ہم نے حفاظت کے معاوضہ میں وصول کیا تھا اُسے رکھنے کا ہمیں کوئی حق نہیں۔ ان میں وہ ایلچی پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے سپہ سالارانِ ایران کے بھرے دربار میں اسلام کے اُصُولِ مساواتِ انسانی کا ایسا مظاہرہ کیا اور ایران کے طبقاتی امتیازات پر ایسی برمحل تنقید کی کہ خدا جانے کتنے ایرانی سپاہیوں کے دلوں میں اس مذہبِ انسانیت کی عزّت و وقعت کا بیج اسی وقت پڑ گیا ہوگا۔ ان میں وہ شہری پیدا ہوئے جن کے اندر اخلاقی ذمّہ داری کا احساس اتنا زبردست تھا کہ جن جرائم کی سزا ہاتھ کاٹنے اور پتھر مار مار کر ہلاک کر دینے کی صورت میں دی جاتی تھی، اُن کا اقبال خود آ کر کرتے تھے اور تقاضا کرتے تھے کہ سزا دے کر انہیں پاک کر دیا جائے تاکہ وہ چور یا زانی کی حیثیت سے خدا کے سامنے پیش نہ ہوں۔ ان میں وہ سپاہی پیدا ہوئے جو تنخواہ لے کر نہیں لڑتے تھے بلکہ اس مسلک کی خاطر جس پر وہ ایمان لائے تھے، اپنے خرچ سے میدانِ جنگ میں جاتے اور پھر جو مالِ غنیمت ہاتھ لگتا وہ سارا کا سارا سپہ سالار کے سامنے لا کر رکھ دیتے تھے۔ کیا اجتماعی اخلاق اور اجتماعی ذہنیت کا اتنا زبردست تغیّر محض لڑائیوں کے زور سے ہو سکتا تھا؟ تاریخ آپ کے سامنے موجود ہے کہیں آپ کو کوئی ایسی مثال ملتی ہے کہ تلوار نے انسانوں کو اس طرح پر بدل ڈالا ہو؟

درحقیقت یہ ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ تیرہ برس کی مدّت میں تو کُل ڈھائی، تین سو مسلمان پیدا ہوئے۔ مگر بعد کے دس سال میں سارا ملک مسلمان ہو گیا۔ اِس معمّے کو لوگ حل نہیں کر سکتے۔ اس لیے عجیب عجیب توجیہیں کرتے ہیں، حالانکہ بات بالکل صاف ہے۔ جب اس نئی آئیڈیالوجی پر زندگی کا نقشہ نہیں بنا تھا، لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ نرالی قسم کا لیڈر آخر کیا بنانا چاہتا ہے۔ طرح طرح کے شبہات دلوں میں پیدا ہوتے تھے۔ کوئی کہتا تھا یہ نری شاعرانہ باتیں ہیں، کوئی کہتا کہ یہ شخص مجنوں ہو گیا ہے، اور کوئی اسے محض ایک خیالی آدمی قرار دے کر گویا اپنے نزدیک رائے زنی کا حق ادا کر دیتا۔ اس وقت تک غیر معمولی ذہانت اور سمجھ رکھنے والے لوگ ہی ایمان لائے جن کی نگاہِ حقیقت بیں اس نئے مسلک میں انسانی فلاح کی صورت صاف دیکھ سکتی تھی۔ مگر جب اس نئے نظامِ فکر پر ایک مکمل نظامِ حیات بن گیا اور لوگوں نے اپنی آنکھوں سے اس کو کام کرتے دیکھ لیا اور اُس کے نتائج اُن کے سامنے عیاناً آ گئے، تب اُن کی سمجھ میں آیا کہ یہ وہ چیز تھی جس کو بنانے کے لیے وہ اللہ

کا ایک بندہ دُنیا بھر کے ظلم سہہ رہا تھا۔ اس کے بعد ضد اور ہٹ دھرمی کے لیے پاؤں جمانے کا کوئی موقع باقی نہ رہا جس کی پیشانی پر بھی دو آنکھیں تھیں اور ان آنکھوں میں نور تھا اس کے لیے آنکھوں دیکھی حقیقت سے انکار کرنا غیر ممکن ہوگیا — حضرات! یہ ہے اس اجتماعی انقلاب کے لانے کا طریقہ جس کو اسلام برپا کرنا چاہتا ہے۔ یہی اس کا راستہ ہے، اسی ڈھنگ پر وہ شروع ہوتا ہے اور اسی تدریج سے وہ آگے بڑھتا ہے لوگ اس کو معجزہ کی قسم کا واقعہ سمجھ کر کہہ دیتے ہیں، اب یہ کہاں ہوسکتا ہے۔ نبی ہی آئے تو یہ کام ہو، مگر تاریخ کا مطالعہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ یہ بالکل ایک طبعی قسم کا واقعہ ہے۔ اس میں علّت اور معلول کا پُورا منطقی اور سائنٹیفک ربط ہمیں نظر آتا ہے۔ آج ہم اس ڈھنگ پر کام کریں تو وہی نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ اس کام کے لیے ایمان، شعورِ اسلامی ذہن کی یکسوئی مضبوط قوّتِ فیصلہ اور شخصی جذبات اور ذاتی اُمنگوں کی سخت قربانی درکار ہے۔ اس کے لیے ان جیالے ہمّت لوگوں کی ضرورت ہے جو حق پر ایمان لانے کے بعد اُس پر پُوری طرح نظر جما دیں۔ کسی دوسری چیز کی طرف توجّہ نہ کریں۔ دنیا میں خواہ کچھ ہوا کرے وہ اپنے نصب العین کے راستے سے ایک انچ نہ ہٹیں۔ دنیوی زندگی میں اپنی ذاتی ترقّی کے سارے امکانات کو قربان کردیں، اپنی امیدوں کا اور اپنے والدین کی تمناؤں کا خون کرتے ہوئے نہ جھجکیں — عزیزوں اور دوستوں کے چھُوٹ جانے کا غم نہ کریں۔ سوسائٹی، حکومت، قانون، قوم، وطن جو چیز بھی اُن کے نصب العین کی راہ میں حائل ہو اُس سے لڑ جائیں۔ ایسے ہی لوگوں نے پہلے بھی اللہ کا کلمہ بلند کیا تھا۔ ایسے ہی لوگ آج بھی کریں گے، اور یہ کام ایسے ہی لوگوں کے کئے سے ہوسکتا ہے۔

فرمایا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن حکیم کے بارے میں کہ:

"إِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ أَقْوَامًا وَيَضَعُ بِهِ آخَرِينَ"

"یقیناً اللہ تعالیٰ اسی کتاب (قرآن مجید) کے ذریعے بہت سی قوموں کو بامِ عروج پر پہنچائے گا اور بہت سی قوموں کو اسی کتاب (کے انکار یا ترک کرنے) کے باعث ذلیل و رسوا کردے گا۔"

(رواہ مسلم رحمہ عن عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ)

تنظیمِ اسلامی

کے پہلے سالانہ اجلاس کی رو داد کا خلاصہ

از قلم : شیخ جمیل الرحمٰن ، ناظم عمومی

"تنظیمِ اسلامی" کے تأسیسی اجلاس منعقدہ ۲۷/۲۸ مارچ ۱۹۷۵ء کی کی رُوداد ماہنامہ "میثاق" کے فروری تا اپریل ۷۷ء کے شماروں میں قسط وار شائع ہو چکی ہے۔ تنظیم کا پہلا سالانہ اجتماع ۲۵/۲۶ / ۱۹۷۶ء کو لاہور میں منعقد ہوا تھا۔ اس اجتماع کی رُوداد کا مُلخّص پیشِ خدمت ہے۔ رُفقائے تنظیم سے اس کے مطالعہ کی خصوصی درخواست ہے۔ (ج۔ر)

"تنظیمِ اسلامی" پاکستان کے پہلے سالانہ اجتماع کی پہلی نشست ۲۵ مارچ اور دوسری نشست ۲۶ مارچ ۷۶ء کو لاہور میں منعقد ہوئی۔ اس اجتماع میں مرکزی نظم سے وابستہ ۳، کراچی کی تنظیم سے وابستہ ۹، سکھر کی تنظیم سے وابستہ ۲۔ لاہور کی تنظیم سے وابستہ ۴۴ اور منفرد رفقاء ۶ کل ۶۴ رُفقاء نے شرکت کی۔ دو حضرات نے اس موقع پر عہدِ رفاقت اُٹھایا۔

دورانِ سال جو رفقاء اپنی نجی و ذاتی مجبوریوں کی وجہ سے علیحدہ ہوئے تھے یا جن کو عدم دلچسپی کی وجہ سے علیحدہ کیا گیا تھا۔ نیز دورانِ سال میں جو نئے رفقاء قافلے میں شامل ہوئے تھے، ان کے کوائف و اعداد و شمار پیش ہو کر ریکارڈ کیے گئے۔ مزید براں اس اجتماع میں یہ رُوح فرسا اطلاع بھی دی گئی کہ "تنظیمِ اسلامی" کے رفیق نعیم الدین ایک روڈ ایکسیڈنٹ کے باعث جاں بحق ہوئے، اِنّا لِلّٰہ وانّا الیہ راجعون —— مرحوم کی مغفرت کی اجتماعی دعا کی گئی —— نظم سے متعلق کارروائی کی تکمیل کے بعد ڈاکٹر اسرار احمد صاحب داعیٔ عمومی نے بطور افتتاحی خطاب، خُطبۂ مسنونہ کے بعد فرمایا :-

رفقائے محترم! یہ اللہ تعالیٰ ہی کا فضل و کرم ہے کہ ہم اپنے پہلے سالانہ اجتماع میں شریک ہو سکے ہیں۔ جو رفقاء دُور دراز کے مقامات سے اپنے وقت اور پیسے کی قربانی کر کے نیز سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے یہاں جمع ہوئے ہیں، اسی طرح لاہور کے جو رفقاء اپنی مصروفیتوں میں سے وقت نکال کر اس اجتماع میں شریک ہوئے ہیں تو اس سارے کام میں اللہ تعالیٰ کی توفیق شامل ہے ہم سب پر اُسی کا شکر واجب ہے۔ آپ کا یہاں جمع ہونا میرے نزدیک فی سبیل اللہ ہے۔ مقصد کا شعور اور اُس کی لگن آپ کو یہاں کھینچ لائی ہے، جس میں تائیدِ خداوندی شامل ہے۔ ورنہ ہو سکتا تھا کہ آپ کی راہ میں ایسی دشواریاں پیدا ہو جاتیں، ایسی رکاوٹیں حائل ہو جاتیں جن پر قابو پانا آپ کے لیے مشکل ہو جاتا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ شیطان وسوسہ اندازی کرتا۔ طرح طرح کے حیلے اور بہانے آپ کو سُجھاتا اور آپ کو اس راہ پر چلنے سے باز رکھنے کی کوشش کرتا اور اس نے ضرور بالضرور اس کی کوشش کی ہو گی، لیکن تواین ہمہ آپ کا ایک ایسے مقصد کے لیے جمع ہونا جس میں خالص دنیوی نقطۂ نظر سے کوئی دلکشی نہیں، کوئی کشش نہیں بلکہ گھاٹے کا سودا ہے کہ اپنا وقت اور پیسہ لگانا پڑا ہے۔ میرے نزدیک توفیقِ الٰہی اور تائیدِ ایزدی کا مظہر ہے۔ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالشُّکْر!

راہِ حق کے ساتھیو! ہم میں سے اکثر نے ایک سال قبل اپنی آزادانہ مرضی سے اپنے پروردگار سے تجدیدِ عہد و میثاق کیا تھا اور پورے شعور کے ساتھ اپنی حیاتِ دُنیوی کا مقصد یہ قرار دیا تھا کہ :- اِنَّ صَلٰوتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ اپنے لیے ہم نے یہ اُصُول بطور زادِ راہ اور نشانِ منزل طے کیا تھا اور ایک قافلہ ترتیب دیا تھا اس قافلہ میں دورانِ سال چند نئے رفیق شامل ہوئے جس پر ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ چند رفقاء اپنی ناقابلِ عبور مجبوریوں کے باعث قافلے سے جدا ہو گئے۔ اس پر ہمیں افسوس و ملال ہونا بالکل فطری ہے لیکن اس میں قابلِ اطمینان پہلو یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی ایسا شخص نہیں ہے جس نے ہماری دعوت اور ہمارے دستورِ اساسی سے اختلاف کیا ہو۔ اُن کے دل آج بھی اس دعوت کے ساتھ ہیں۔ چند ایسے لوگ بھی ہیں جو ایک وقتی اور ہنگامی جوش کے زیرِ اثر تنظیم میں شامل ہوئے تھے، لیکن وہ اس جوش و ولولہ کو قائم و باقی نہ رکھ سکے۔ ہم ان سب حضرات کے لیے دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو اسی راہ کا راہی بنا دے جس راہ پر ہم گامزن ہیں بلکہ صحیح تر یہ ہے کہ اس راہ کی طرف ہم نے لرخ

کر رکھا ہے۔ ابھی پیش قدمی کا حق ادا نہیں ہو سکا ہے۔

رفقائے گرامی! 'تنظیم اسلامی' کا یہ سالانہ اجتماع محض دستور کے تقاضا کے تحت منعقد نہیں کیا گیا بلکہ اس اجتماع کے تین بنیادی مقاصد ہیں۔

● سب سے اہم اور مقدم مقصد یہ ہے کہ ہم از سرِ نو پُورے شعور اور انشراحِ صدر کے ساتھ اپنے تعلق کو اس نصب العین اور مقصد کے ساتھ اُستوار کریں جس کے لیے ہم نے 'تنظیم اسلامی' کی تشکیل کی تھی۔ پھر اس نصب العین اور مقصد کے حصول کے لیے جو طریقِ کار ہم نے متعین کیا تھا، اُس کو اپنے قلوب و اذہان میں از سرِ نو اُجاگر کریں اور پھر ایک نئے عزم، نئی اُمنگ، اور نئے اور تازہ جوش و ولولہ کے ساتھ اس سفر کو جاری رکھیں، جس کا ہم نے پچھلے سال آغاز کیا تھا۔

● دُوسرا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ہم کھلے دل کے ساتھ گذشتہ ایک سال کے کام کا جائزہ لے کر دیکھیں کہ ہماری رفتارِ کار کیا ہے! ہم نے اپنے مقصد کے لیے کوئی پیش قدمی بھی کی ہے! یا بس صحیح رُخ متعین کر کے ہم مطمئن ہو بیٹھے ہیں! ہمارے رفقاء میں انفرادی طور پر کوئی نمایاں تبدیلی آئی ہے یا نہیں! اجتماعی سطح پر ہم نے کوئی کام کیا ہے یا نہیں! اگر اس جائزہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچیں کہ صورتِ حال اطمینان بخش ہے تو فبہا و المراد اگر تشویشناک ہے تو اسباب و علل کا جائزہ لیں اور اُن کو واضح طور پر متعین کر کے اصلاح کی تدابیر سوچیں اور اُن پر عمل پیرا ہونے کے لیے نقشۂ کار طے کریں۔

● تیسرا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اجتماعی مسائل کے متعلق باہمی مشورہ سے فیصلے کئے جائیں۔ دستور میں اگر کسی ترمیم کی ضرورت محسوس ہو رہی ہو تو اس پر غور کریں لائحہ عمل میں تبدیلی کی ضرورت ہو تو واضح طور پر اس ضرورت کو متعین کریں اور اس پر غور و فیصلہ کریں۔ آئندہ کے لیے ایک واضح منصوبہ بندی کریں کہ آنے والے سال میں ہم نے کیا کرنا ہے!!!

اگر مذکورہ بالا تین بنیادی مقاصد کو اختصار سے بیان کیا جائے یا اُن کا خلاصہ نکالا جائے تو وہ یہ ہوگا کہ:

● پہلا اہم و مقدم مقصد ہے، تجدیدِ عہد و میثاق اور از سرِ نو شعوری سطح پر اپنے دینی فرائض اور ذمہ داریوں کا شدید احساس پیدا کرنا۔

● دوسرا بنیادی مقصد :- خود احتسابی اور جائزہ گویا STOK TAKING

● تیسرا بنیادی مقصد :- منصوبہ بندی BUDGETTING

رفقائے محترم! اِن تمہیدی کلمات کے بعد میں چاہتا ہوں کہ میں نے اس سالانہ اجتماع کے جو تین بنیادی مقاصد معیّن کیے ہیں، ان میں سے ہر ایک پر پہلے اپنے خیالات و احساسات اور تجربات آپ کے سامنے پیش کردوں۔

ہماری تنظیم کی تاسیس کا مقصدِ وحید یہ ہے کہ از روئے کتاب و سُنّت ہر مسلمان پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے چند اہم دینی فرائض عاید ہوتے ہیں، جن کو بجا لانے کی ہر ممکن کوشش کے بغیر نجاتِ اُخروی ممکن نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس کا شعور بعض حضرات کو پہلے سے حاصل ہو۔ بعض کو میرے درسِ قرآن حکیم، خطابات، تحریرات اور بالخصوص مرتّب کردہ منتخب قرآنی نصاب سے حاصل ہوا ہو۔ لیکن جو بات قدرِ مشترک ہے وہ یہ ہے کہ ہر شخص پر یہ فرض براہِ راست عاید ہوتا ہے جس کی ادائیگی کی اس کو فکر کرنی چاہیئے۔ اس فرض کی ادائیگی کے لیے 'تنظیم' ضروری ہے اور چونکہ فی الوقت پاکستان میں کوئی ایسی ہیئتِ اجتماعیہ موجود نہیں ہے جو ان دینی ذمّہ داریوں کو ادا کرنے کے لیے کوشاں ہو۔ جو جماعتیں یا جمعیتیں موجود ہیں تو ان میں سے اکثر وقتی و ہنگامی سیاست کے دلدل میں پھنسی ہوئی ہیں۔ یا کسی جُزوی دینی کام کو کل دین سمجھ لینے کے مغالطہ میں مبتلا ہیں یا اُن کا طریقِ کار قرآن و سُنّت میں بیان کردہ طریقِ کار اور منہج سے کامل طور پر مطابقت نہیں رکھتا۔ اس کے کسی ایک جُزء کو وہ کُل سمجھنے کی غلط فہمی کی شکار ہیں۔ لہٰذا احساسِ فرض نے مجبور کیا کہ میں اپنے دینی فرائض کی انجام دہی کے لیے: "مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ" کی پکار بلند کروں۔ میں نے ۱۹۵۷ء سے جماعت اسلامی سے علیحدگی کے بعد مسلسل دس بارہ سال کوشش کی کہ جو اکابر اور اہلِ علم و صلاحیت جماعت سے پالیسی اور طریقِ کار کے اختلاف اور جماعت کے اپنے اساسی موقف سے انحراف کے باعث جماعت سے علیحدہ ہوئے ہیں، وہ پیش قدمی کریں اور ایک دینی، اُصُولی اور انقلابی ہیئتِ اجتماعیہ قائم کریں جو اظہارِ حق اور اقامتِ دین نیز شہادت علی النّاس کو اپنا مطمحِ نظر اور رضائے الٰہی کے حُصُول کو اپنا نصب العین بنائے تو میں اُس میں ایک کارکُن کی حیثیت سے کھپ جاؤں۔ لیکن جب اِس بات کی کوئی صورت نظر نہیں آئی تو پھر مجھے شدّت سے اِس امر کا احساس ہوا کہ اس طرح مجھ سے میری وہ ذمّہ داری کسی طور پر ساقط نہیں ہوتی جو

از رُوئے مطالعۂ قرآن مجید مجھ پر واضح ہو چکی ہے چنانچہ مَیں نے ۱۹۶۸ء کے اوائل سے اللہ کے بھروسے پر تعلیم و تعلّم اور درس و تدریسِ قرآنِ حکیم کا آغاز کیا۔ اس کام سے مجھے ایک فائدہ یہ حاصل ہوا کہ مجھے اپنے دینی فرائض کا جو شعور و احساس حاصل ہوا تھا وہ پختہ سے پختہ تر ہوتا چلا گیا اور مَیں اس نتیجہ پر پہنچا کہ تعلیم و تعلّمِ قرآن کے کام سے آگے بڑھ کر ایک ہیئتِ اجتماعی تشکیل دینی بھی دین ہی کا تقاضا ہے۔ لہٰذا احساسِ ادائیگیِ فرض اور احساسِ مسئولیّت کی بنا پر مَیں نے یہ فیصلہ کیا کہ مَیں خود ہی ایک قافلہ ترتیب دینے کی کوشش کروں اور خود ہی ایک کشتی بنانے کی سعی کروں۔ مَیں نے تربیت گاہ منعقدہ جولائی ۱۹۷۴ء میں اپنی زندگی کے اس اہم فیصلہ کا اعلان کر دیا۔ جو 'میثاق' کے ستمبر ۱۹۷۴ء کے شمارے میں شائع بھی کر دیا گیا!!!

میری اِس پکار کے نتیجے میں چند اللہ کے بندے اِس راہ میں میرے اعوان و انصار بننے کے لیے آگے بڑھے اور انہوں نے ان دینی فرائض کی انجام دہی کے لیے جن کا شعور انہیں براہِ راست قرآنِ حکیم کے دروس سے حاصل ہوا تھا۔ تنظیم کی رفاقت اختیار کی۔ ہم میں سے ہر شخص پر یہ بات ہر وقت واضح رہنے کی شدید ضرورت ہے کہ تنظیم کی شمولیّت مجھ پر یا کسی اور پر ہرگز احسان نہیں ہے بلکہ وہ اپنے دینی فرض کی ادائیگی کے لیے تنظیم کا رفیق بنا ہے چونکہ دینی فرائض بالخصوص اظہارِ دینِ حق اور شہادت علی النّاس کی جدّوجہد اور فرد کی اپنی ذاتی اصلاح، سمع و طاعت پر مبنی کسی اسلامی تنظیم کے قیام کے بغیر انتہائی مشکل ہے۔ لہٰذا تنظیم اسلامی میں اس کی شمولیّت توفیقِ الٰہی کی بدولت حاصل ہوئی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا احسان اور فضل ہے جو اس پر ہوا ہے نہ کہ اس کا کسی پر احسان ہے۔

رفقائے محترم! اس بات کو خوب اچھی طرح جان لیجئے اور ذہن نشین کر لیجئے کہ تنظیم اسلامی کی تأسیس کرنے والا اور آپ کو راہِ حق میں اپنے انصار بننے کی دعوت دینے والا ہرگز ہرگز اس دعویٰ کے ساتھ سامنے نہیں آیا ہے کہ وہ "مردِ کامل" بن چکا ہے اور وہ آپ کو سال دو سال میں اس منزل تک پہنچا دے گا جہاں پہنچنا مقصود ہے، ایسی کوئی بات نہیں ہے اصل معاملہ یہ ہے کہ مجھے اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کا جذبہ اور شعور علامہ اقبال مرحوم کی شاعری سے ملا۔ اِس پر رنگ مولانا مودودی کی تحریروں نے بھرا۔ قرآن مجید کے مطالعہ اور اس میں تدبّر کرنے کا ذوق مجھے مولانا امین احسن اصلاحی کی تحریروں سے حاصل ہوا۔ پھر میں نے اپنے دینی فرائض

کو قرآن کریم کی روشنی میں سمجھا اور اب میں پورے وثوق کے ساتھ جانتا ہوں کہ ایک مسلمان کے فرائض کیا ہیں میں پورے شعور کے ساتھ یہ بھی جانتا ہوں کہ جس مسلمان پر بھی قرآن حکیم کے مطالعہ سے اس کے فرائض اور ذمہ داریاں منکشف ہو جائیں وہ عند اللہ مسئول ہے۔ اس سے لازماً احتساب ہوگا کہ جو شعور تم کو عطا کیا گیا تھا، جو فرائض دینی تم پر منکشف کئے گئے تھے۔ جن ذمہ داریوں کا احساس تم کو ودیعت کیا گیا تھا، اُن کو ادا کرنے کی تم نے کیا فکر کی؟ کیا سعی و کوشش کی؟ کیا عملی اقدامات کئے؟ یہی احساسِ مسئولیت ہے کہ جس کے باعث اللہ کے بھروسے پر میں نے دعوت کا آغاز کیا تھا اور یہ پکار بلند کی تھی کہ:۔

مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ

میں اپنی علمی اور عملی کمزوریوں کو خوب جانتا ہوں مجھے اپنی کمزوریوں کا شعور پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے۔ میں یہ بات بھی جانتا ہوں کہ جس دن بھی میں اس فریبِ نفس میں مبتلا ہوا کہ میں مردِ کامل بن چکا ہوں، تو وہی دن دینی نقطۂ نظر سے میری ہلاکت و بربادی کا دن ہوگا بحمداللہ میں کسی مغالطہ یا فریبِ نفس میں مبتلا نہیں ہوں، من آنم کہ من دانم۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے اس کے متعلق مجھے اپنی کوتاہیوں کا پورا شعور اور احساس ہے۔ میں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں مردِ کامل ہوں۔ میرے ساتھ آؤ، میں تمہارا تزکیہ کروں گا، تمہیں سلوک کی وادیاں طے کراؤں گا، تمہارے لیے تعلق مع اللہ کا وسیلہ بنوں گا۔ میں نے جو دعوت دی ہے اور جس راستہ پر چلنے کے لیے آپ کو پکارا ہے، وہ یہ ہے کہ اس پُرفتن دور میں نیکی کی راہ پر اکیلے چلنا ممکن العمل ہی نہیں پھر تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کے فریضہ کی انجام دہی کے لیے سمع و طاعت پر مبنی ایک نظم جماعت لابدی ہے اس لیے آؤ تجدیدِ ایمان، توبہ اور تجدیدِ عہد کے لیے ایک تنظیم قائم کریں۔ ایک دوسرے کا سہارا بنیں۔ مل جل کر ایک دوسرے کی اصلاح کریں، ایک دوسرے کی خامیوں کو خلوص، ہمدردی اور دلسوزی کے ساتھ دور کرنے کی کوشش کریں اور شانہ بشانہ اس راہ پر گامزن ہوں جو اللہ تعالیٰ نے مومنینِ صالحین کے لیے متعین فرمائی ہے اور اپنی کتاب مبین میں اس صراطِ مستقیم کی تمام منازل اور نشاناتِ راہ بیان فرما دیے ہیں نیز جس راہ پر گامزن ہو کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے ہمارے سامنے اُسوۂ حسنہ اور عملی نظائر پیش فرما دیے تھے۔

میرا کامل ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت اعلیٰ خلقت پر پیدا کیا ہے:۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۔ اِس میں بے پناہ قوتیں اور صلاحیتیں رکھی ہیں، لیکن انسان کی سب سے بڑی کمزوری اُس کا اپنا "نفس" ہے، اُس کے صحیح رُخ پر پرواز میں اگر کوئی رُکاوٹ ہے تو وہ خود ہے یعنی اُس کا اپنا نفس — انسان کو کوئی چیز شکست نہیں دے سکتی مگر اُس کا اپنا نفس جیسا کہ انگریزی کا مشہور مقولہ ہے :

MAN IS DEFEATED BY HIMSELF ALONE !

نفس کے اِس منہ زور گھوڑے کو ہم نے قابو میں کرنا ہے، چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر مسلمان کے تزکیے اور اصلاح کے لیے ان الفاظ میں ابدی ہدایت دے دی کہ : اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهٗ فِیْ طَاعَةِ اللّٰهِ ۔ لہٰذا اصل جہاد اپنے نفس سے شروع ہوتا ہے گویا نفس کو اللہ اور اُس کے رسول کا مطیع و فرمان بردار بنانا جہاد کی پہلی منزل ہے اور قتال فی سبیل اللہ اس جہاد کا تکمیلی مرحلہ ہے اور اِس راہ میں نقدِ جان کی قربانی پیش کرنا وہ سعادت ہے کہ جس سے بڑی سعادت ایک بندۂ مومن تصوّر نہیں کر سکتا۔ راہِ حق میں علمی و عملی جدّوجہد کرنے والوں، دعوتِ حق اور ابلاغِ دینِ مُبین کے لیے سعی کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ اپنا انصار قرار دیتا ہے اور اس راہ میں نقدِ جان پیش کرنے والوں کو شہید کے لقب سے سرفراز فرماتا ہے۔

رفقائے محترم ! اب مَیں چاہتا ہوں کہ ہم اپنے ان مقاصد کو تازہ کر لیں جن کی بجاآوری کے لیے ہم 'تنظیم اسلامی' میں شامل ہوئے ہیں۔

۱۔ اِس تنظیم کا پہلا مقصد یہ ہے کہ اس کا ہر رفیق اپنے مقصدِ تخلیق کو ہر وقت اور ہر آن اپنے سامنے رکھے : وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ۝ یعنی عبادتِ ربّ :۔ یہ عبادت پُورے ذوق و شوق اور اپنے خالق کی محبت سے سرشار ہو کر کامل اطاعت کے ساتھ پُوری زندگی میں انجام دینی ہے۔ یہ وہ بنیادی فرض ہے جس کا ہر مسلمان مُکلّف ہے اور ہر مسلمان نے اِس کو ادا کرنا ہے۔ اس عبادتِ ربّ کے بھی دو دائرے یا دو مراحل ہیں :

● پہلا دائرہ یا مرحلہ ہر مسلمان کی انفرادی زندگی سے تعلق رکھتا ہے، جس پر فوری طور پر عمل کرنا فرض ہے۔ اِس کو کسی حال میں ملتوی نہیں کیا جا سکتا، اِس میں تاخیر و تعویق ایمان کے منافی ہے۔ اِس معاملے میں ماحول کی ناسازگاری کا عذر اللہ کے

ہاں بالکل بے وزن ہوگا۔

● دوسرا دائرہ یا مرحلہ اجتماعی زندگی سے تعلق رکھتا ہے، جس پر چلنا اسلامی نظام عملاً نافذ ہوئے بغیر ممکن نہیں۔ لہٰذا کتاب و سُنّت کے تعلیم کردہ طریقِ کار کے مطابق ایک ایسا اسلامی معاشرہ قائم کرنے کی اجتماعی طور پر عملی جدّوجہد ضروری ہے جس میں اسلامی نظام نافذ ہو سکے اور جاری و ساری رہ سکے۔

۲۔ اِس تنظیم کا دوسرا مقصد ہے شہادت علی النّاس کا فریضہ انجام دینے کی سعی و جہد کرنا۔ (میرے محدود مطالعہ میں قرآن و حدیث میں "شہادتِ حق" کی اصطلاح کہیں استعمال نہیں ہوئی، جہاں بھی ذکر ہے وہ شہادت علی النّاس ہے۔)

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۝ (سورۂ بقرہ)

وَجَاهِدُوْا فِى اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِى الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِىْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ؕ (سورۂ حج)

نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اُمّتی ہونے کی حیثیت سے یہ فرض اُمّتِ مُسلمہ پر بحیثیت اُمّت عاید ہوتا ہے۔ چونکہ نبی اکرم خاتم النّبیّن ہی نہیں خاتم المرسلین بھی ہیں اب قیامت تک حضورؐ ہی کا دورِ رسالت جاری و ساری رہے گا اور نوعِ انسانی رُشد و ہدایت کی محتاج رہے گی۔ لہٰذا نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ۲۳ سالہ محنتِ شاقہ کے نتیجے میں ایک اُمّت تشکیل دے کر شہادت علی النّاس کا فریضہ اُمّت کے سپرد کر دیا۔ اب یہ اُمّت کا فرضِ منصبی ہے کہ وہ اپنے قول و عمل سے نوعِ انسانی کے سامنے حق کی شہادت دے۔ اگر اُمّت بحیثیت اُمّت اِس فرض سے غافل ہو جائے تو ازرُوئے قرآنِ حکیم جن لوگوں کو بھی اس فرض کے شعور کی توفیق ملے، اُن کا فرض ہے کہ وہ منظّم ہوں اور اس فرضِ منصبی کو ادا کرنے کی کوشش میں اپنی صلاحیتیں اور توانائیاں کھپا دیں: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (آلِ عمران)

۳- اِس تنظیم کا تیسرا مقصد ہے اظہارِ دینِ حق کی عملی جدّوجُہد کرنا :-
درحقیقت یہ پہلے اور دوسرے مقاصد کا تکمیلی مرحلہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک مسلمان اقامتِ کُلّی کے ساتھ عبادتِ ربّ کے فرض کی ادائیگی سے عہدہ برا نہیں ہوسکتا جب تک "اسلام" بحیثیتِ حکمران غالب نہ ہو اور ہماری انفرادی زندگی سے لے کر اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ میں : اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ط کا اٹل اُصول بلکہ حکم کارفرما نہ ہو۔
اسی طرح شہادت علی النّاس کا فرض بھی صحیح طور پر اسی وقت انجام پاسکتا ہے جب اللہ کا دین بہ تمام وکمال قائم ونافذ ہو اور بنی نوعِ انسان اس نظام کے چلتے پھرتے نمونے اور اس کی برکات کا سر کی آنکھ سے مشاہدہ کرسکیں۔ لہٰذا اظہارِ دینِ حق کی سعی وجُہد پُوری اُمّت کے فرائضِ منصبی میں داخل ہے۔ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی حیاتِ طیّبہ میں جزیرہ نمائے عرب میں اس کی تکمیل فرمادی تھی اور وہ نظامِ عدل عملاً قائم فرمادیا تھا جو حضورؐ کی بعثت کا مقصدِ خصُوصی تھا۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ط (سورۃ الصّف)

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ط (الشوریٰ)

وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ (الشوریٰ)

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ط (آل عمران)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ز (البقرہ)

اِسی نظامِ عدل پر خلافتِ راشدہ قائم رہی اسی لیے اس نظام کو خلافت علیٰ منہاج النّبوّت کہا جاتا ہے۔ اسی نظامِ عدل کے قیام ونفاذ کے لیے صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے اپنی زندگیاں کھپائیں۔
یہ ہے ہمارے دینی فرائض کا وہ اجمالی تصوّر جس کی بنیاد پر ہماری تنظیم کی تأسیس ہوئی اور جس کا پیشِ نظر اور مستحضر رکھنا تنظیم کے ہر رفیق کے لیے لازمی اور ضروری ہے۔
اب میں 'تنظیم اسلامی' کے طریقِ کار کے چند بنیادی اُمُور کی طرف آپ کی توجّہ مبذول

کرانا چاہتا ہوں۔ یہ اُمور قرار دادِ تاسیس اور اُس کی توضیحات میں شرح و بسط کے ساتھ بیان ہو چکے ہیں یہاں اختصار و اجمال کے ساتھ اُن کی تذکیر مقصود ہے۔

● ہمارے نزدیک دین کا اصل مخاطب فرد ہے لہٰذا ہماری تنظیم کے پیشِ نظر فرد کی اخلاقی و رُوحانی تکمیل اور فلاح و نجاتِ اُخروی اوّلیت کا درجہ رکھتی ہے۔ تنظیم کو محض "کارکُن" درکار نہیں بلکہ ایسے رفیق مطلوب ہیں جن کا اوڑھنا بچھونا عبادتِ ربّ اور اتباعِ سُنّت ہو۔

● دین میں دعوت کے لیے ایک فطری ترتیب بیان کی گئی ہے۔ اپنی ذات کی اصلاح کے ساتھ ساتھ بتدریج دعوت کا حلقہ بڑھانا چاہیئے۔ اِس میں "الاقرب فالاقرب" کے اُصُول کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ اِس کی فطری تدریج یہ ہے کہ اصلاح کا عمل اپنی ذات سے شروع ہو کر بیوی بچّے، کُنبہ، خاندان، اہلِ محلّہ، بستی، شہر اور ملک اور بعدہٗ بین الاقوامی سطح کی طرف بڑھنا چاہیئے:

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا ۝ (التحریم)

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۝ (الشعراء)

● شہادت علی النّاس کے ذیل میں ہماری تنظیم کے نزدیک اہم ترین کام یہ ہے کہ فلسفہ اور فکرِ جدید کے ان مادّہ پرستانہ اور گمراہ کُن نظریات کا قرآنِ حکیم اور احادیث شریفہ کے محکم استدلال سے ابطال کیا جائے۔ جنھوں نے نوعِ انسانی کے فہیم و ذہین لوگوں کے فکر و نظر پر قبضہ کر رکھا ہے اور جس نے ہماری اپنی مسلمان نئی نسل کے خرمنِ ایمان و یقین کی جڑوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ موجودہ دور کی جاہلیّتِ جدیدہ کے ردّ اور ابطال کے لیے ایک زبردست علمی تحریک بپا کی جائے۔ ساتھ ہی ساتھ جاہلیّتِ قدیمہ پر جو دین کے لبادے میں ملبوس مشرکانہ و مبتدعانہ عقاید و اعمال کی شکل میں اُمّتِ مسلمہ کو گھُن کی طرح کھا رہی ہے نہایت حکیمانہ انداز میں تنقید کر کے اصلاح کی سعی کی جائے۔

رُفقائے محترم! جماعتی زندگی میں دو کام بڑے مشکل ہیں۔ پہلا تنقید و محاسبہ اور دوسرا مشورہ دینا۔ اس وقت میں پہلے مسئلہ کے متعلق آپ کے سامنے اسلامی تعلیمات و آداب کی روشنی میں چند بنیادی باتیں رکھنا چاہتا ہوں:۔

● پہلی یہ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے دین کو "النصیحۃ" قرار دیا ہے۔ نصیحت کے اصل معنی خیر خواہی کے ہیں۔ اگر آپ اپنے کسی رفیق میں دینی اور تنظیمی لحاظ سے کوئی کوتاہی یا تقصیر دیکھیں تو آپ کا پہلا فرض یہ ہے کہ آپ اس رفیق سے تنہائی میں ملیں اور پوری ہمدردی و دلسوزی کے ساتھ اس کی توجہ اس کوتاہی یا تقصیر کی طرف مبذول کرائیں۔ آپ کا انداز ایسا ہونا چاہیئے کہ وہ آپ کو واقعی اپنا بہی خواہ اور درد مند سمجھے نہ کہ ناقد۔

● دوسری یہ کہ اپنے جس رفیق کو اُس کی کسی تقصیر یا کوتاہی یا نقص کی طرف جو شخص بھی توجہ دلانا چاہتا ہے اُس کا اپنا دامن تو اس سے پاک ہونا چاہیئے۔

● تیسری یہ کہ اس کوشش کے باوجود اگر اصلاحِ حال کی صورت نظر نہ آئے تو اس کو مقامی داعی یا پھر داعیٔ عمومی کے علم میں لانا چاہیئے تاکہ وہ اپنے طور پر اصلاح کی کوشش کر سکے۔

● اجتماعات میں کسی کو بھی اپنی تنقید و محاسبہ کا ہدف نہ بنایئے اِلّا آنکہ مصالح دین اس کے متقاضی ہوں۔

● صرف معائب ہی کو نہ دیکھئے بلکہ محاسن کو بھی دیکھئے بلکہ ان کو وقعت دیجئے۔ حضورؐ کے ایک قول کا مفہوم ہے کہ "محبت ہو تو معائب نظر نہیں آتے، عداوت ہو تو محاسن نظر نہیں آتے" او کما قال صلی اللہ علیہ وسلم

● تنقید و محاسبہ کے ان آداب و شرائط کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے جماعتی زندگی میں بڑی پیچیدگیاں اور بعض اوقات تلخیاں اور عداوتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ دُعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اس سے محفوظ رکھے۔

اب میں تنظیم کی رفتارِ کار کا صحیح تجزیہ اور اپنا حقیقی تأثر پیش کرنا چاہتا ہوں میرے نزدیک رفتارِ کار نہ اطمینان بخش ہے اور نہ ہی تشویشناک، بلکہ بین بین ہے۔ غیر اطمینان بخش میں اس لیے کہتا ہوں کہ مرکزی نظم کے لحاظ سے ہم ایک سال قبل جس مقام پر کھڑے تھے، آج بھی اُسی مقام پر کھڑے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ فی الواقع ابھی تک ہمارا مرکزی نظم قائم ہی نہیں ہوا۔ اِس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ ناظمِ عمومی کے لیے جن بزرگ رفیق کا تقرر عمل میں آیا تھا وہ اپنی چند ذاتی مجبوریوں کی وجہ سے نقلِ مکانی نہ کر سکے۔ میں شکوہ و شکایت کے

نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ امرِ واقعی کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ اس امید و آس کی وجہ سے کہ مقرر کردہ مستقل ناظمِ عمومی نقلِ مکانی کرکے مرکزی دفتر کی ذمہ داریوں کو سنبھال لیں گے۔ مرکزی نظم سے متعلق تمام کام تعویق بلکہ COLD STORAGE میں پڑے رہے اور عملی طور پر مرکزی نظم تاحال صحیح نہج پر قائم نہ ہوسکا۔ جب ان رفیق کی نقلِ مکانی سے قطعی مایوسی ہوگئی تو ۲۲ نومبر ۱۹۷۵ء کو لاہور میں ایک مشاورت منعقد کی گئی جس کے نتیجہ میں جناب بشیر ملک صاحب کا بحیثیت ناظمِ عمومی تقرر عمل میں آیا اور جناب قمر سعید صاحب کو مرکزی بیت المال کا ناظم مقرر کیا گیا۔ اِن دونوں رفقاء پر مرکزی انجمن خدام القرآن کی بھی بہت سی ذمہ داریاں ہیں۔ پھر ماضی میں یہ کسی تحریک سے وابستہ نہیں رہے، لہٰذا کسی ایسی تنظیم کا جو اصلاً تحریکی مزاج اور تقاضے رکھتی ہے ان رفقاء کو کوئی سابقہ تجربہ نہیں، پھر بھی خدا کا شکر ہے کہ ان حضرات نے بساط و استعداد کے مطابق ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی ہے میں شدت سے اس امر کا قائل ہوں کہ انسان جو کچھ سوچتا ہے اُس کا پورا کرنا مسبّب الاسباب کی مشیت پر منحصر ہوتا ہے لہٰذا میں اِس صورتِ حال پر شاکر و صابر ہوں اور اسی میں خیر سمجھتا ہوں۔ یہاں یہ بات میں نے صورتِ واقعہ کے طور پر بیان کی ہے۔

رفقائے محترم! اب میں ایک سال کی کارگزاری کے بارے میں اپنا ذاتی تاثر پیش کرنا چاہتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے اپنی جگہ یہ طے کر رکھا تھا کہ اگر ایک سال تک ہم جڑے رہ گئے تو میرے نزدیک یہ بھی بہت بڑی کامیابی ہے۔ اِس اجمال کی شرح یہ ہے کہ تنظیم دنیا کے کٹھن اور مشکل ترین کاموں میں سے ایک ہے۔ اجتماعی زندگی ایک ایسے پھول کی مانند ہوتی ہے کہ ذرا تیز ہوا چلے تو پھول کی پتّیاں بکھر جاتی ہیں۔ اِس زندگی میں بڑے مشکل امتحانات آتے ہیں۔ اپنے مزاج اور طبیعت کے خلاف دوسروں کی باتیں سننی پڑتی ہیں۔ ایک دوسرے کی زیادتیوں کو انگیز کرنا ہوتا ہے۔ اپنی ذاتی اور انفرادی رائے کا ایثار کرنا ہوتا ہے۔ صحیح و غلط ہر قسم کی تنقید خندہ پیشانی سے برداشت کرنی ہوتی ہے۔ ایک دوسروں کی تقصیروں کو معاف کرنا ہوتا ہے۔ طبیعتوں اور مزاجوں کے اختلافات کی رعایت ملحوظ رکھنی ہوتی ہے۔ اِس پر مستزاد یہ کہ تنظیم بھی وہ ہو جو ٹھیٹ اسلامی اصولوں پر تشکیل پائی ہو جس میں دنیوی نقطۂ نظر سے کوئی کشش اور دل کشی (CHARM) نہ ہو۔ جس میں نہ عہدے ہوں نہ مناصب، نہ الیکشن کی گہما گہمی ہو نہ جلسے نہ جلوس اور نہ نعروں کی ہماہمی اور ہنگامہ آرائی۔ جس میں اپنا مال کھپانا

ہو اور اپنے جسم و جان کی توانائیاں اور صلاحیتیں لگانی ہوں۔ جس میں اِن حُدود و قیود اور شرائط کی بالالتزام پابندی کرنی ہو جو اصل کے اعتبار سے تو دینی اوامر و نواہی ہیں لیکن عملاً دینی فرائض سے خارج ہیں۔ اِس پُرفتن دَور میں جبکہ زندگی کے ہر شعبہ پر طاغوت کی فرمان روائی ہے کوئی مسلمان خالصتاً خوفِ خدا اور مُحاسبۂ اُخروی کے ڈر سے اِن چیزوں کو ترک کر دے یا ترک کرنے کی کوشش کرے کہ جن کو عامّۃُ النّاس ہی نہیں، بڑے بڑے متقی اور پرہیزگار بلکہ رجالِ دین تک حرام و ناجائز سمجھنا تو درکنار کسی نوع سے ان کاموں کو غلط ہی نہیں سمجھتے اور انہیں ھَنِیئاً مَّرِیئاً خیال کرتے ہیں، اِلّا ماشاء اللہ۔ بڑے ہی ایثار اور قربانی کا کام ہے۔ آج کے اِس دَور میں انکم ٹیکس کے غلط گوشوارے داخل کرنا، چنگی، کسٹم اور ڈیوٹی بچانے کی تدابیر اختیار کرنا امپورٹ اور ایکسپورٹ کے لیے بنکوں سے OVER DRAFT لینا اور اس پر سُود ادا کرنا۔ انشورنس پالیسیاں لینا۔ بچت (SAVING) کی اِن تمام اسکیموں میں سرمایہ لگانا جن میں سُود ملتا ہے۔ رشوتیں لینا اور دینا۔ بینکوں اور انشورنس کمپنیوں کی ملازمتوں اور آسامیوں پر فائز ہونے کو اپنے لیے باعثِ افتخار سمجھنا، اپنے مکانوں اور بنگلوں کی تعمیر کیلئے ہاؤسنگ فائنانس کارپوریشنوں سے سُودی قرضے حاصل کرنا، دینی نقطۂ نظر سے قابلِ احتساب نہیں ہے۔ اِن کاموں سے کسی کے ضمیر میں خلش تک نہیں ہوتی، ان کی قباحت اور دینی لحاظ سے اُن کے حرام ہونے کا کسی کو احساس تک نہیں ہوتا، اِلّا ماشاء اللہ! ایسے حالات میں چند اللہ کے بندوں کا تنظیمِ اسلامی سے اِس عزم کے ساتھ جُڑے رہنا کہ وہ شعوری طور پر اِن تمام کاموں کو قطعاً حرام سمجھتے ہیں اور اس سے اپنا دامن بچائیں گے اور جس کے دامن پر یہ داغ موجود ہیں وہ توبہ اور پشیمانی کے آنسوؤں سے اِس داغ کو دھونے کی کوشش کریں گے صرف اس لیے کہ وہ نجات و فلاحِ اُخروی کے اُمیدواروں میں جگہ پاسکیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت کے سزاوار قرار پاسکیں۔ میرے نزدیک بہت ہی قابلِ قدر کامیابی ہے۔ اس کو UNDER-RATE نہ کیجیے بلکہ گہرائی میں جاکر تجزیہ کیجیے کہ یہ کامیابی ہے یا نہیں۔

پھر مَیں ذاتی طور پر اس بات کو جانتا ہوں کہ ہمارے بعض رفقاء میں عظیم ترین انقلاب آیا ہے۔ اُن کے مشاغل تبدیل ہوگئے ہیں، اُن کی دلچسپیوں کا محور بدل گیا ہے۔ آپ کو ایسے رفیق بھی ملیں گے کہ جو شاید خود بھی اور اُن کا حلقۂ اثر بھی یہ تصوّر نہیں کرسکتا کہ ان کے مُنہ پر سُنّت کے اتباع میں ڈاڑھیاں آجائیں گی گو اس معاملہ میں بعض رفیق ابھی ضعفِ ارادہ میں

مبتلا نظر آتے ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر اُن کے عزم و ارادہ میں خلوص اور للّٰہیت ہے تو اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اس کمزوری پر وہ جلد قابو پالیں گے۔

ہمارے بعض رفیق ہم سے الگ ہو گئے ہیں۔ قدرتی بات ہے کہ اُن کی علیحدگی کا آپ کو رنج و ملال ہوگا۔ مجھے بھی اس بات کا شدید افسوس ہے بلکہ میں عرض کروں گا کہ جب کوئی رفیق اپنے کام میں سُست ہوتا نظر آتا ہے یا نظم کی پابندی میں ڈھیلا دکھائی دیتا ہے یا کوئی رفیق تنظیم سے جُدا ہوتا ہے تو اُس کا بڑا گہرا احساس میرے دل پر مترتّب ہوتا ہے۔ بعض اوقات میرا تاثر یہ ہوتا ہے کہ یہ بھی میری ذاتی کمزوری ہے۔ مجھ میں وہ کشش پیدا نہیں ہوئی کہ اُن کو خود سے جوڑے رکھتا یا ان کو بھی اُسی جذبہ اور جوش سے واقف کرا دیتا جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عنایت کیا ہے۔

بہرحال یہ بات ہم سب کے لیے قابلِ اطمینان ہے کہ 'تنظیم اسلامی' کے دستورِ اساسی یا تنظیم کے داعی سے اختلاف کے باعث تاحال کوئی ہم سے جدا نہیں ہوا۔ وہ اس کو حق تسلیم کرتے ہیں، البتہ اپنی ذاتی مجبوریوں، رکاوٹوں اور کچھ بندھنوں کے باعث وہ تنظیم کے ساتھ چلنے کی ہمت نہیں پا رہے۔ لیکن اُن کی ہمدردیاں، ان کی دلچسپیاں اور ان کا عملی تعاون ایک دوسری شکل (مرکزی انجمن خُدّام القرآن کے ساتھ تعلّق) میں جاری و ساری ہے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ۝

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۝ (جاری)

عنقریب شائع ہو رہی ہیں

مولانا امین احسن اصلاحی کی دو معرکۃ الآراء

تصانیف

(۱) اسلامی ریاست ——— (۲) پاکستانی عورت دوراہے پر

مکتبہ مرکزی انجمن خُدّام القرآن لاہور

تنظیمِ اسلامی

کی اساسی دعوت

تجدیدِ ایمان	توبہ	تجدیدِ عہد

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ

(النّسآء : ۱۳۶)

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا

(التّحریم : ۸)

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَمِیْثَاقَهُ الَّذِیْ وَاثَقَكُمْ بِهٖۤ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا

(المآئدۃ : ۷)

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیْۤ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ وَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ

(البقرۃ : ۴۰)

انبیاء کرام کے طریق دعوت اور نہج انقلاب کے موضوع پر

مولانا امین احسن اصلاحی کی اہم تصانیف

۱- دعوتِ دین اور اس کا طریق کار

صفحات ۲۱۲، مضبوط جلد اور خوشنما ڈسٹ کور کے ساتھ: قیمت فی نسخہ ۱۰/-

۲- اقامتِ دین کے لئے انبیاء کرام کا طریقِ کار

صفحات ۲۸، خوشنما کور کے ساتھ - قیمت فی نسخہ ۱/۲۵

شائع کردہ: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

دو ذیلی انجمنیں

۱- انجمن خدام القرآن راولپنڈی سلام آباد

معرفت: کرنل (ریٹائرڈ) عبدالغفور شیخ، ۵۰ - اے، سلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی

۲- انجمن خدام القرآن سکھر

معرفت: جناب نجیب صدیقی، سندھ جنرل سٹور، شاہی بازار - سکھر

ماہنامہ 'میثاق' کی توسیع اشاعت میں تعاون فرمائیے!

ان شاء اللہ العزیز

یکم جولائی ۷۷ء کو تعطیل جمعہ کے عملی نفاذ کے بعد سے لاہور میں

صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے ہفتہ وار کا پروگرام

حسب ذیل رہے گا :-

۱۔ ہر جمعرات کی شام کو بعد مغرب، قرآن اکیڈمی، ماڈل ٹاؤن میں جس میں مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب زیر درس ہے !

۲۔ ہر جمعہ کو قبل از نماز جمعہ جامع مسجد خضراء سمن آباد میں جس میں قرآن مجید کے مسلسل درس کے ضمن میں اس وقت سورۃ البیاء (سترھواں پارہ) زیر درس ہے

۳۔ ہر ہفتہ کی شام کو بعد مغرب جامع مسجد شہداء ریگل چوک میں جہاں قرآن مجید کے مسلسل درس کے ضمن میں اس وقت سورۃ نساء زیر درس ہے

۴۔ ہر اتوار کی شام کو بعد مغرب جامع مسجد' ای، بلاک ماڈل ٹاؤن میں جہاں آخری پارے کی چھوٹی سورتیں آخر سے سلسلہ وار زیر درس ہیں !

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی کتاب عزیز کا فہم بھی عطا فرمائے اور اس پر عمل کی توفیق بھی ارزانی فرمائے - آمین

المعلن : ناظم اعلیٰ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

Regd. L. No. 7360

Monthly MEESAQ Lahore

Vol. 25 | JUNE 1977 | No. 6

جماعتِ اسلامی

- کن مقاصد کے تحت قائم ہوئی تھی؟
- آزادی سے قبل اس کے نظریات کیا تھے؟
- قیامِ پاکستان کے بعد اس نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا؟ اور
- اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے؟

جماعت کے ماضی و حال کا ایک تاریخی تجزیہ جماعت کے سابق کارکن کے قلم سے

تحریکِ جماعتِ اسلامی

ایک تحقیقی مطالعہ

تالیف

ڈاکٹر اسرار احمد ایم اے ایم بی بی ایس

سابق ناظمِ اعلیٰ اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان و امیرِ جماعت اسلامی منٹگمری

قیمت فی نسخہ ۶/۰۰ (محصول ڈاک علاوہ)

منگوانے کا پتہ

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی

۳۶ - کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور